ماہنامہ

اشراق

لاہور

جولائی ۲۰۲۲ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور ’بِسْمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ‘ کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔“

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۴ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۲۲ء ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ

فہرست

شذرات

قربانی — جاوید احمد غامدی — ۴

قرآنیات

البیان: السجدہ ۳۲: ۱-۱۴ (۱) — جاوید احمد غامدی — ۶

دین و دانش

قربانی: ملت ابراہیمی کی یادگار — محمد ذکوان ندوی — ۱۳

مقالات

''میزان'': توضیحی مطالعہ: قانون معیشت (۲) — محمد عمار خان ناصر — ۱۶

نقطۂ نظر

'خاتم النبیین' میں 'ختم نبوت' کا قطعی مفہوم — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۲۶

تصادم یا بقائے باہمی؟ — خورشید احمد ندیم — ۲۹

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۹) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۳

اصلاح و دعوت

قربانی: سوچنے کی کچھ باتیں — ابو یحییٰ — ۴۸

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

جاوید احمد غامدی

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قربانی کی تاریخ

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلونٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب پشت بہ پشت لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے

اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

قربانی کا مقصد

اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسۡمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكۡبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

قربانی کا قانون

اِس کا قانون یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰/ ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں 'ایام تشریق' کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔ اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

(الاسلام ۱۱۹-۱۲۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ السجدۃ

(۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۗ ﴿٢﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓمّٓ'[٦٣] ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس کتاب کی تنزیل جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اِسے خود گھڑ لیا ہے؟[٦٤] ہرگز نہیں، بلکہ یہ تیرے

٦٣۔ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

٦٤۔ یہ استفہام حیرت و استعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ایسے اندھے بہرے ہو گئے ہیں کہ قرآن جیسی کتاب کو تمھارا افترا قرار دے رہے ہیں۔

قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴

پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے،[۶۵] اِس لیے کہ تم اُن لوگوں کو[۶۶] خبردار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، اِس لیے کہ وہ راہ پر آجائیں۔ ۱-۳

(یہ اُس کے شریک بناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں[۶۷] پیدا کیا، پھر اپنے عرش پر متمکن ہو گیا۔[۶۸] اُس کے سوا نہ تمھارے لیے کوئی کارساز ہے، نہ اُس کے مقابل میں سفارش کرنے والا، پھر کیا دھیان نہیں کرتے ہو؟ ۴

۶۵۔ یعنی اِس لحاظ سے بھی حق کہ فی الواقع خدا کی طرف سے ہے اور اِس لحاظ سے بھی کہ جو کچھ اُس میں بیان کیا گیا ہے، اُس میں کسی باطل کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۶۶۔ یعنی قریش مکہ کو، جن کے اندر اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، دراں حالیکہ وہ زمین پر خدا کے اولین معبد کے متولی بنائے گئے تھے۔

۶۷۔ اِس سے خدائی ایام مراد ہیں جو ہمارے ہزاروں لاکھوں سال کے برابر بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ بات اِس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بتائی جاتی ہے کہ خدا نے یہ دنیا نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ بنائی ہے، لہٰذا اِسے کھیل تماشا خیال نہ کرو، اِس کا ایک مقصد ہے اور یہ اُسی کے پیش نظر وجود میں آئی ہے۔

۶۸۔ یعنی پیدا کر کے اُس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے، بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر بالفعل اُس کا انتظام بھی فرما رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۶﴾

الَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ﴿۷﴾ ثُمَّ

آسمان سے زمین تک وہی تمام معاملات کی تدبیر فرماتا ہے،[۶۹] پھر وہ اوپر اُس کی طرف لوٹتے ہیں،[۷۰] ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری گنتی سے ہزار سال کے برابر ہے۔[۷۱] وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم ہے۔[۷۲] ۵-۶

(وہی کہ) جس نے جو چیز بھی بنائی ہے، خوب ہی بنائی ہے۔[۷۳] انسان کی تخلیق کا آغاز اُس نے

۶۹۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اُس کی حکومت صرف آسمان تک محدود ہے اور زمین کا انتظام اُس نے کچھ دوسرے لوگوں کے سپرد کر رکھا ہے، جیسا کہ بعض احمق سمجھتے ہیں۔

۷۰۔ یعنی اُس کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اور وہ براہ راست دیکھتا ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے کیا فرائض انجام دیے اور کس طرح انجام دیے ہیں۔

۷۱۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ خدا کے معاملات کو سمجھنے میں انسان بعض اوقات جلد بازی کرنے لگتا ہے، دراں حالیکہ وہ ہزار ہزار سال کے لیے ایک ہی مرتبہ طے کر کے کارکنان قضا و قدر کے سپرد کر دیے جاتے ہیں اور خدا کی متعین کردہ حکمت کے مطابق سامنے آتے رہتے ہیں، لوگوں کی خواہش کے مطابق اُن میں ہر روز ترمیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۷۲۔ اِس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ وہ پورے حسن ظن کے ساتھ اُسی پر بھروسا رکھیں، تھڑدلے ہو کر دوسروں کے دروازے پر نہ چلے جائیں۔

۷۳۔ یعنی ایسی متناسب، موزوں اور اپنے اوصاف و خصائص کے لحاظ سے ایسی کامل بنائی ہے کہ اُس میں نہ کسی نقص کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، نہ کوئی ترمیم پیش کی جا سکتی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

مٹی سے کیا،[۷۴] پھر اُس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے چلائی،[۷۵] پھر اُس کے نوک پلک سنوارے اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دیا[۷۶] اور تمھارے (سننے کے) لیے کان اور (دیکھنے

۷۴۔ یہ پہلے مرحلے کا بیان ہے، جب انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا۔ اِس کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو انسان کی پیدایش کے لیے اب اختیار کیا جاتا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ اب جو عمل ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، اُس وقت زمین کے پیٹ میں ہوا۔ چنانچہ مٹی کے وہی اجزا جو غذا کی صورت میں ہمارے اندر جاتے اور حقیر پانی کے خلاصے میں تبدیل ہو کر اُس عمل کی ابتدا کرتے ہیں جس سے انسان بنتے ہیں، اُس وقت سڑے ہوئے گارے کے اندر اِسی عمل سے گزرے۔ یہاں تک کہ جب خلقت پوری ہو گئی تو اوپر سے وہی گارا انڈے کے خول کی طرح خشک ہو گیا جس کے ٹوٹنے سے جیتی جاگتی ایک مخلوق نمودار ہوئی جسے انسان کا حیوانی وجود کہنا چاہیے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسری تمام مخلوقات بھی پہلی مرتبہ اِسی طریقے سے وجود میں آئیں۔

۷۵۔ یہ دوسرا مرحلہ ہے جس میں اِس طرح بنائی جانے والی مخلوق نے اپنی نسل آپ پیدا کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ وہی عمل جو زمین کے پیٹ میں ہوا تھا، اب وہ ماں کے پیٹ میں ہونے لگا۔ یہ انسان کا وہ دور ہے، جب وہ علم و ادراک سے محروم محض ایک ناتراشیدہ حیوان تھا۔

۷۶۔ یہ تیسرا مرحلہ ہے جس میں غالباً کئی نسلوں کے اختلاط سے انسان کے حیوانی وجود کو نک سک سے درست کیا گیا، یہاں تک کہ وہ اِس قابل ہو گیا کہ اُسے انسان کی شخصیت عطا کی جائے۔ چنانچہ اِس مخلوق کے جو افراد اُس وقت موجود تھے، اُن میں سے دو کا انتخاب کر کے خدا کی طرف سے ایک لطیف پھونک کے ذریعے سے جسے قرآن میں روح کہا گیا ہے، یہ شخصیت اُسے عطا کر دی گئی۔ یہی آدم و حوا تھے۔ اِس کے بعد جو انسان پیدا ہوئے، وہ سب اِنھی کی اولاد ہیں۔

قرآن کے اِس بیان سے، اگر غور کیجیے تو اُن تمام آثار کی نہایت معقول توجیہ ہو جاتی ہے جو سائنسی علوم کے ماہرین نے اب تک دریافت کیے ہیں اور جنھیں ڈارونیت کے علم بردار اپنی تائید میں پیش کرتے اور اِس طرح

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ط بَلْ هُمْ
بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٠﴾ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ

کے لیے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لیے) دل بنا دیے[77] — تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو![78] ۷-۹
(یہ اُس خدا کی شانیں ہیں جس نے اِنھیں پیدا کیا ہے۔ اِس کے باوجود) کہتے ہیں[79] کہ جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو کیا پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ نہیں، یہ اِس کو بعید نہیں سمجھتے،[80] بلکہ یہ اپنے پروردگار کے حضور پیشی کے منکر ہیں۔[81] اِن سے کہو، تمھاری جان وہی موت

اُن گتھیوں کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے نظریے میں نہ پہلے حل ہوئی ہیں، نہ آیندہ کبھی ہوں گی۔

۷۷۔ یہ نفخ روح کا نتیجہ ہے جس نے بصیرت و ادراک سے محروم ایک حیوان کے اندر سمع و بصر اور دل و دماغ کی وہ صلاحیتیں پیدا کر دیں جو تمام حیوانات کے مقابل میں اُس کے لیے وجہ امتیاز ہیں۔ چنانچہ اب وہ اِس قابل ہو گیا کہ اُسے مخاطب کر کے یہ کہا جاسکے کہ ہم نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے۔ قرآن نے اِسی بنا پر صیغۂ غائب کو یہاں پہنچ کر صیغۂ خطاب میں تبدیل کر دیا ہے۔

۷۸۔ یعنی اِس کے باوجود کہ اِن سب مراحل سے گزر کر اُس مقام تک پہنچے ہو، جہاں اب اپنے آپ کو دیکھ رہے ہو، لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ چنانچہ کبھی خدا کا انکار کرتے اور کبھی اُس کے شریک ٹھیرانے لگتے ہو۔

۷۹۔ یعنی طنز و استہزا کے ساتھ سوال کرتے ہیں۔

۸۰۔ یعنی ایسے غبی نہیں ہیں کہ خدا کی یہ شانیں دیکھتے ہوئے اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اُس کی قدرت سے بعید سمجھیں۔

۸۱۔ یعنی اِس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ایک دن خدا کے آگے پیش ہو کر اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بسا اوقات انسان انکار تو کسی اور چیز کا کرنا چاہتا ہے، لیکن اُس کے انکار کے لیے بہانہ کسی اور چیز کو بناتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہ راست اُس حقیقت کے انکار کی کچھ زیادہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿١١﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا
رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا
مُوْقِنُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ

کا فرشتہ قبض کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۸۲] اگر تم دیکھتے، (اے پیغمبر، تو اِن کی بے بسی کا کچھ اندازہ کر پاتے)، جب یہ مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا، اب تو ہمیں واپس بھیج دے کہ ہم نیک کام کریں، ہمیں پورا یقین آ گیا ہے۔ (جواب میں ارشاد ہو گا: پھر امتحان کی کیا ضرورت تھی)؟ اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اُس کی ہدایت خود ہی دے دیتے،[۸۳] لیکن (ہم نے تمھیں امتحان میں ڈالا اور تم نے ہدایت پر گم راہی کو ترجیح دی، سو) میں نے

گنجایش وہ نہیں پاتا۔ مشرکین عرب کا حال بھی یہی تھا۔ وہ خدا کے قائل تھے، اِس وجہ سے خدا کے آگے پیشی کا صریح انکار اُن کے لیے مشکل تھا، لیکن اُس کو ماننے سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، وہ اُن کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اِس وجہ سے اُس سے گریز کے لیے اول تو وہ قیامت پر اُس قسم کے شبہات وارد کرتے تھے جس کی ایک مثال اوپر گزری اور بدرجۂ آخر اُس کو مانتے بھی تھے تو اُس کے نتائج سے بچاؤ کے لیے اُنھوں نے شرکا و شفعا ایجاد کر لیے تھے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۶۲)

۸۲۔ مطلب یہ ہے کہ انکار تو کر سکتے ہیں کہ خدا نے ہر شخص کو دنیا میں اِس کی آزادی دے رکھی ہے، مگر اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کے حضور میں پیشی سے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں، خدا نے ہر ایک کے لیے موت کا فرشتہ مقرر کر رکھا ہے۔ جب اِن کا وقت آئے گا تو کوئی اور نہیں، وہی فرشتہ اِن کی روح قبض کر کے اِنھیں حاضر کر دے گا۔ اِس سے کسی کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔

۸۳۔ مدعا یہ ہے کہ حقائق کو اِس طرح بے نقاب کر دینے کے بعد لوگوں کا ایمان اللہ کو پسند ہوتا تو اُس امتحان کی کوئی ضرورت نہیں تھی جس کے لیے تمھیں دنیا میں بھیجا گیا۔ اِس طرح کا ایمان لانے پر تو اُس وقت بھی تمھیں مجبور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ ہماری اسکیم نہیں تھی۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ علم و عقل کی جو نعمت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ
لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

جو بات کہی تھی، پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر کر چھوڑوں گا۔[۸۴] اِس لیے اب چکھو اِس کا مزہ کہ تم نے اپنے اِس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تمھیں بھلا دیا ہے۔[۸۵] اب چکھو اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہمیشہ کا عذاب۔ ۱۰-۱۴

ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہے، اُس سے کام لے کر تم اِن حقائق کا اعتراف کرتے ہو یا نہیں؟ تم اِس امتحان میں ناکام ہو چکے ہو۔ اب دوبارہ اُسی امتحان کے لیے تمھیں دنیا میں بھیج دیا جائے تو اُس کا نتیجہ کچھ بھی مختلف نہ ہو گا۔ اِس وقت جو کچھ دیکھ رہے ہو، اُس کی یاد ذہن سے محو ہوتے ہی تم وہی کچھ کرو گے جو پہلے کرتے رہے ہو۔

۸۴۔ یعنی اُن سب جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا جو شیطان کے بہکانے سے اِس امتحان میں ناکام ہو جائیں گے۔ یہ اُس بات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے جواب میں روز ازل کہی تھی، جب اُس نے چیلنج دیا تھا کہ میں اِن سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔ ابلیس کا یہ چیلنج سورۂ ص (۳۸) کی آیات ۸۲-۸۵ میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ وہ بات پوری ہو گئی اور اُسے پورا ہونا ہی تھا، اِس لیے کہ جب لوگوں کو امتحان میں ڈالا گیا تو اُس امتحان کے نتائج بھی لازماً سامنے آنا تھے۔

۸۵۔ یعنی نظر انداز کر دیا ہے، لہٰذا تمھاری کوئی درخواست اور التجا اب ہمارے نزدیک درخور اعتنا نہیں رہی۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد ذکوان ندوی

قربانی: ملت ابراہیمی کی یادگار

قربانی جان کی نذر ہے۔ اِس دنیا میں خدا کو ایک انسان سے جو رویہ مطلوب ہے، وہ اسلام[1] ہے، یعنی اپنے قول و فعل ہر اعتبار سے اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینا۔ قربانی اِسی 'اسلام' کا ایک علامتی اظہار اور اُس پر قائم رہنے کا ایک سالانہ عہد (covenant) ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، قربانی کا اصل مقصد اپنے اندر تقویٰ[2] اور خدا پرستانہ زندگی کی تعمیر ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک محض گوشت کا ڈھیر لگانے اور خون کا دریا بہا دینے سے اصل مطلوب (خدا پرستی) حاصل نہیں ہوتا، جس کا ظاہرہ زوال یافتہ اہل کتاب اور موجودہ زمانے کے بیش تر مسلمانوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ اِس کے برعکس، قربانی سے خدا کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ اِس کو پیش کرنے والے اہل ایمان کے اندر تقویٰ اور خدا پرستی کی وہ روح ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان و مال اور اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کر سکیں۔

اِس اعتبار سے دیکھیے تو قربانی کوئی سالانہ رسم نہیں، بلکہ وہ خود آدمی کے اپنے جان اور مال کی نذر کی علامت ہے۔ امت مسلمہ میں جاری ہونے والی قربانی کی یہی وہ عظیم روایت ہے جسے قرآن میں 'ذبح عظیم' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: 'وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ'۔[3]

۱۔ آل عمران ۳: ۱۹۔

۲۔ الحج ۲۲: ۳۷۔

۳۔ یعنی ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اسمٰعیل کو چھڑا لیا (الصافات ۳۷: ۱۰۷)۔

حج اور عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک شخص جب قربانی پیش کرتا ہے تو وہ اِس کی صورت میں اپنے جان اور مال کو خدا کے لیے وقف کرنے کا یہی عہد کرتا ہے۔ اِس عمل کے ذریعے سے وہ اپنی بقیہ زندگی کو تقویٰ اور خدا پرستی کے رنگ (صِبْغَةَ اللّٰهِ)[4] میں رنگ دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ قربانی اور حج کا عمل انجام دے کر وہ اپنی نسبت سے اُس 'ملت ابراہیمی' کی تجدید کرتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اِس طرح کیا گیا ہے: 'مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا'۔[5]

خدا نے اپنے پیغمبر کے واسطے سے تمام اہل ایمان کو اِسی 'ملت ابراہیمی' کے اتباع[6] کا حکم دیا ہے۔ 'ملت ابراہیمی' کسی گروہی ڈھانچے یا زوال یافتہ 'مذہب' کا نام نہیں۔ اِس سے مراد 'احسان' کے درجے میں ایمان اور عمل صالح کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کر دینا ہے۔ قرآن میں اِس 'ملت ابراہیمی' کی نمایاں صفات درج ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ تسلیم و رضا (البقرہ ۲: ۱۳۱)

۲۔ حنیفیت (آل عمران ۳: ۶۷)

۳۔ صدق (مریم ۱۹: ۴۱)

۴۔ اِنابت (ہود ۱۱: ۷۵)

۵۔ شکر (النحل ۱۶: ۱۲۱)

۶۔ دعا اور قنوت (البقرہ ۲: ۱۲۸-۱۲۹۔ الشعراء ۲۶: ۸۳-۸۹۔ النحل ۱۶: ۱۲۰)

۷۔ قلب سلیم (الصافات ۳۷: ۸۴)

۸۔ حلم و بردباری (ہود ۱۱: ۷۵)

۹۔ دل سوزی و دردمندی (التوبہ ۹: ۱۱۴)

۱۰۔ جود و سخا (ہود ۱۱: ۶۹۔ الذاریات ۵۱: ۲۴-۲۷)

۴۔ البقرہ ۲: ۱۳۸۔

۵۔ یعنی ابراہیم نہ 'یہودی' تھا اور نہ 'نصرانی'، بلکہ وہ ہر دوسری چیز سے الگ ہو کر خدا کے لیے پوری طرح یک سو اور اُس کا حکم بردار تھا (آل عمران ۳: ۶۷)۔

۶۔ النحل ۱۶: ۱۲۳۔

۱۱۔ کامل وفاداری (النجم ۵۳: ۳۷)

حج اور عیدالاضحیٰ جیسے موقعوں پر قربانی کا عمل انجام دے کر ایک مومن اِنھی ابراہیمی صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنے کا عہد لیتا اور اِسی ابراہیمی سنت کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جس شخص کی قربانی اُس کے اندر سچی خدا پرستی کی روح پیدا کرے، اُسی کی قربانی مقبول قربانی ہے۔

قربانی کا مقصد نہ گوشت خوری ہے اور نہ محض کسی سالانہ 'مذہبی' رسم کی ادائیگی۔ قربانی کا مقصد تقویٰ اور خدا پرستانہ زندگی کی تعمیر ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: 'لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ'۔[7]

اِس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قربانی سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ تقویٰ اور خدا پرستی ہے۔ سچی خدا پرستی اور "اللہ کے لیے جینے اور مرنے" (الانعام ۶: ۱۶۲) کی یہی صفت ہے جو خدا کو مطلوب ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ قربانی کے اِس عمل کے ذریعے سے آدمی کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۷۔ یعنی اللہ کو ہرگز نہ تمھاری اِن قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ یہ صرف تمھارا تقویٰ ہے جسے خدا کے یہاں قبولیت حاصل ہوتی ہے (الحج ۲۲: ۳۷)۔

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ — توضیحی مطالعہ

قانون معیشت

(۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ضرر و غرر پر مبنی صورتیں

”بیع و شرا اور مزارعت وغیرہ کی یہ صورتیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دی ہیں۔اِن کے بارے میں یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ ضرر و غرر کی جس علت پر یہ مبنی ہیں، وہ اگر شرائط و احوال کی تبدیلی سے کسی وقت اِن میں مفقود ہو جائے تو جس طرح اِن کی ممانعت ختم ہو جائے گی،اِسی طرح تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں یہ علت اگر کسی حادث معاشی معاملے میں ثابت ہو جائے تو اُس کی اباحت بھی باقی نہ رہے گی۔“(میزان ۵۰۴)

مصنف نے خرید و فروخت اور تجارت سے متعلق دو درجن کے قریب ایسی صورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے احادیث میں منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعتیں قرآن مجید کے اس اصول پر مبنی ہیں کہ انسان ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھائیں۔ باطل طریقے سے دوسرے کا مال حاصل کرنے کی بعض صورتیں، مثلاً سود اور جوا، ایسی ہیں جن سے یہ پہلو الگ نہیں ہو سکتا اور وہ فی نفسہٖ ممنوع ہیں، جب کہ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں فی نفسہٖ تو کوئی قباحت نہیں پائی جاتی، البتہ وہ کسی اضافی پہلو سے دوسروں کو نقصان پہنچانے اور ان کی حق تلفی کو مستلزم ہو جاتی ہیں۔

دوسری نوعیت کی صورتوں میں ممانعت مطلق نہیں، بلکہ اس وجہ کے پائے جانے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے جس کے باعث ایک فی نفسہٖ جائز امر کو ممنوع قرار دیا گیا۔ چنانچہ فقہا کے نزدیک یہ ایک متفقہ اصول ہے کہ جن احکام کا مدار علت پر ہوتا ہے، ان میں حکم کی ظاہری شکل کی نہیں، بلکہ علت کی پیروی مطلوب ہوتی ہے اور علت کے بدل جانے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر بعض صورتوں میں بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حدیث کی مخالفت ہو رہی ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہ مخالفت خود متکلم کا منشا اور اس کے کلام کا مخفی تقاضا ہوتی ہے۔

ابن دقیق العید نے فقہا کے اس اصول کو یوں واضح کیا ہے:

والمعنى إذا كان معلومًا كالنص قطعًا أو ظنًا مقاربًا للقطع فاتباعه وتعليق الحكم به أولى من اتباع مجرد اللفظ. (احکام الاحکام ۱/ ۳۱۷)

''حکم کی علت اگر اس کے الفاظ کی طرح قطعیت کے ساتھ یا قطعیت کے قریب ظن غالب سے معلوم ہو تو اس کی پیروی کرنا اور حکم کو اس کے ساتھ وابستہ کرنا محض الفاظ پر حکم کا مدار رکھنے سے بہتر ہے۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مثال کے طور پر احادیث میں تجارتی قافلے کے، شہر میں پہنچنے سے پہلے شہر سے باہر جا کر اس سے سامان خریدنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے (بخاری، رقم ۲۱۶۵)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بازار میں پہنچنے سے پہلے قافلے والوں سے مال نہ خریدو۔ اگر کسی نے خرید لیا تو مال کے مالک کو بازار میں آنے کے بعد (اگر معلوم ہو کہ اس کا مال بازار سے کم قیمت پر خریدا گیا ہے تو اسے اپنا مال واپس لینے کا) اختیار ہے'' (مسلم، رقم ۲۷۹۶)۔

حدیث سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منشا قافلے والوں کو دھوکے سے بچانا ہے، جس کے لیے آپ نے انھیں اپنا مال واپس لینے کا حق دے دیا، جب کہ اسی پہلو سے پہلی روایت میں قافلے سے خریدے گئے مال کو آگے بیچنے سے منع فرما دیا تاکہ بائع اگر اپنا مال واپس لینا چاہے تو ایسا کرنا ممکن ہو اور آگے بیچ دیے جانے کے باعث کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ گویا یہ حکم ''اضرار'' کی علت پر مبنی ہے جو اس صورت میں دو پہلوؤں سے پائی جا سکتی ہے: ایک یہ کہ شہر سے باہر قافلے والوں سے مال خریدنے والا ان کو بازار کی صحیح قیمت سے آگاہ نہ کرے اور کم قیمت پر ان سے مال خرید لے۔ دوسرے یہ کہ ان سے مال خریدنے کے بعد بازار میں آکر اپنی مرضی کے نرخ پر اسے فروخت کرے۔ گویا ایک پہلو سے قافلے والوں کا نقصان ہے اور دوسرے پہلو سے شہر والوں کا، لیکن اگر کسی جگہ ''اضرار'' کے ان دونوں پہلوؤں میں سے کوئی پہلو موجود نہ ہو تو جمہور فقہا کے نزدیک قافلے

والوں سے شہر سے باہر مال خرید لینے میں کوئی حرج نہیں (طحاوی، شرح معانی الآثار ۴/ ۸۔ ملا علی القاری، مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۶۹)۔

اسی طرح روایات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھلوں کی بیع ان کی ''صلاح'' ظاہر ہو جانے سے پہلے نہ کی جائے، یعنی اس وقت کی جائے جب پھل متوقع آفات اور بیماریوں سے دور ہو جائیں اور خالص تندرست پھل رہ جائے (بخاری، رقم ۲۱۹۴)۔

روایات میں اس ممانعت کا پس منظر یہ بیان ہوا ہے کہ لوگ کچے پھلوں کی بیع کیا کرتے تھے۔ جب پھل اتارنے کا وقت آتا اور خریدار پھل وصول کرنے آتے تو کہتے کہ پھل تو خراب ہو گیا ہے یا اس کو فلاں اور فلاں بیماری لگ گئی ہے۔ جب لوگ اس طرح کے جھگڑے کثرت سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم جھگڑوں سے باز نہیں آتے تو جب تک پھلوں کی ''صلاح'' ظاہر نہ ہو جائے اس وقت تک ان کی بیع نہ کیا کرو (بخاری، رقم ۲۱۹۳)۔ آپ نے فرمایا کہ بتاؤ، اگر اللہ پھل (کے پکنے) کو روک دے (اور وہ خراب ہو جائے) تو کس چیز کے بدلے میں تم اپنے بھائی (خریدار) کا مال لیتے ہو؟ (بخاری، رقم ۲۱۹۸)۔

گویا ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ کچے پھلوں کی بیع کرنے کی صورت میں خطرہ موجود رہتا ہے کہ پکنے سے پہلے پھلوں کو کوئی خرابی لاحق ہو جائے اور وہ برباد ہو جائیں۔ اس صورت میں خریدار کی رقم، جو وہ ادا کر چکا ہے، ضائع چلی جائے گی اور بائع اور خریدار میں جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ جمہور فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ کچے پھلوں کی بیع مطلقاً منع نہیں ہے، بلکہ جہاں یہ علت نہیں پائی جاتی، وہاں کچے پھلوں کی بیع جائز ہو گی۔ اگر بیع میں یہ طے کر لیا جائے کہ پھل، سودے کے فوراً بعد اتار لیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ نہ بعد میں ان کے درختوں پر خراب ہونے کا اندیشہ ہو گا اور نہ اس کی وجہ سے بائع اور خریدار میں جھگڑے کی نوبت آئے گی۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال بازار میں فروخت کروائے (بخاری، رقم ۲۱۶۵)۔

جمہور فقہا نے اس روایت پر اس کی ظاہری شکل میں عمل کرنے کے بجائے حکم کا مدار علت پر رکھا ہے اور کہا ہے کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اگر دیہاتی کسی دلال کے واسطے سے اپنا مال فروخت کرے گا تو ظاہر ہے، وہ اصل قیمت میں اپنا کمیشن شامل کر لے گا جس سے بازار میں اس چیز کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی دیہاتی اپنا مال خود فروخت کرے گا تو اپنی اصل لاگت پر جو منافع وہ وصول کرے گا، وہ مناسب ہو گا اور اس میں

شہر والوں کے لیے آسانی ہو گی۔ اس علت کی وضاحت خود حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'لا يبع حاضر لباد دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض'، ''کوئی شہری کسی دیہاتی کا سامان فروخت نہ کرائے۔ لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے رزق دیتا رہے'' (مسلم، رقم ۲۷۹۹)، یعنی شہر کے لوگ، دیہاتی کے براہ راست فروخت کرنے سے ملنے والی سہولت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

جب یہ حکم اس علت پر مبنی ہے تو ایسے حکم کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر علت ختم ہو جائے تو اس پر مبنی حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر فقہا کے نزدیک اگر صورت یہ ہو کہ کوئی شہری اپنے فائدے کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کسی دیہاتی کا مال بازار میں فروخت کراتا ہے کہ اس کو بازار کے نرخ کے مطابق اپنے مال کی صحیح قیمت مل جائے تو یہ جائز ہے، کیونکہ ممانعت کی وجہ ختم ہوگئی ہے (شرح معانی الآثار ۱۱/۴)۔

خواتین کی گواہی

''دو مردوں اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا جو ضابطہ اِن آیات میں بیان ہوا ہے، اِس کا موقع اگرچہ متعین ہے، لیکن ہمارے فقہا نے اِسے جس طرح سمجھا ہے، اِس کی بنا پر ضروری ہے کہ یہ دو باتیں اِس کے بارے میں بھی واضح کر دی جائیں:

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اِس ضابطے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔... شہادت کی اِن دونوں صورتوں کا فرق اِس قدر واضح ہے کہ اِن میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوب بیان میں اِس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ اِسے قانون و عدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔... یہ ایک معاشرتی ہدایت ہے جس کی پابندی اگر لوگ کریں گے تو اُن کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح و فلاح کے لیے اِس کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔'' (میزان ۵۱۵-۵۱۶)

''یہ سد ذریعہ کا حکم ہے۔ چنانچہ عورتوں کے حالات میں تبدیلی کے باعث اِس کی ضرورت باقی نہ رہے تو

اِس پر عمل کرنا بھی ضروری نہیں ہوگا۔‘‘(میزان ۵۱۴، حاشیہ ۳۴)

قرآن مجید میں مختلف معاشرتی معاملات میں، مثلاً یتیموں کو ان کا مال سپرد کرتے، وصیت کرتے اور طلاق دیتے وقت گواہ مقرر کرنے کی ہدایت ایک تسلسل کے ساتھ دی گئی ہے۔ ان میں سے کسی مقام پر گواہوں کی جنس زیر بحث نہیں آئی اور سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸۲ وہ واحد مقام ہے جہاں اس تفریق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ادھار لین دین کے معاملات میں اول تو گواہ دو مرد ہونے چاہییں، اور اگر دو مرد نہ ہو سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ مقرر کر لیا جائے۔ ہدایت سے واضح ہے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ عورتیں گواہی کے معاملات سے اصلاً دور ہی رہیں اور اگر انھیں گواہ بنایا جائے تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔

جمہور فقہا نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ شارع کا منشا عورتوں کی گواہی کو ناقص قرار دینا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک خواتین کی گواہی صرف مالی معاملات میں قابل قبول ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی گواہی قبول کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان کے علاوہ باقی معاملات، مثلاً نکاح وطلاق، حدود اور قصاص وغیرہ میں فقہا کے ایک بڑے گروہ کے نزدیک عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں (بدایۃ المجتہد ۲/ ۴۶۵)۔ احناف نے اس حکم کی تعبیر اس کے بالکل برعکس کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جب ایک طرح کے معاملے میں عورتوں کی گواہی قبول کی گئی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت اصلاً گواہی دینے کی اہلیت رکھتی ہے، اس لیے اصول اور عقل وقیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طرح کے معاملے میں عورت کی گواہی قبول کی جائے، الّا یہ کہ کسی معاملے میں اس کے برعکس دلیل پائی جائے (ابن الہمام، فتح القدیر ۷/ ۳۰۲۔ کاسانی، بدائع الصنائع ۶/ ۲۷۹)۔ البتہ احناف اس معاملے میں جمہور کے ہم خیال ہیں کہ حدود وقصاص کے مقدمات میں خواتین کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور یہ کہ ایسے معاملات کے علاوہ جن میں مردوں کا اطلاع پانا عادتاً ممکن نہیں، باقی تمام معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر سمجھی جائے گی۔

امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن القیم نے اس بحث میں عام فقہی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور فقہا نے اس ہدایت کی توجیہ خواتین کے ناقص العقل ہونے یا ان کے حفظ وضبط کے کم زور ہونے یا مردوں کے مقابلے میں ان کی کم تر سماجی حیثیت کو واضح کرنے کے حوالے سے کی ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ابن القیم لکھتے ہیں کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو گواہ بنانے کی حکمت خود قرآن مجید نے

یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ معاملے کے فریقین کے لیے محض ایک تدبیری نوعیت کی ہدایت ہے۔ اس کا عدالت اور قضا سے کوئی تعلق نہیں اور قاضی کے سامنے اگر ایک عورت بھی قابل اعتماد طریقے سے گواہی دے تو قاضی اس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے۔

ابن تیمیہ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ حکم کی علت کی رو سے دو عورتوں کی گواہی کو مطلقاً ایک مرد کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ایک عورت کی گواہی کو دوسری عورت کی گواہی سے موکد کرنے کا اہتمام انھی معاملات میں مطلوب ہے جن میں تجربہ اور ممارست کی کمی کے باعث خواتین کے بھول چوک یا عدم ضبط کا شکار ہو جانے کا خدشہ ہو۔ ان کے علاوہ باقی امور میں، جہاں وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر پورے اعتماد سے گواہی دے سکتی ہیں، ان کی گواہی مردوں کے برابر ہی سمجھی جائے گی (ابن القیم، اعلام الموقعین ۸۳۔ الطرق الحکمیۃ ۱۷۷)۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ہاں بھی اس ہدایت کے حوالے سے یہی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس فقہی اختلاف کے تناظر میں کہ کیا عورت کی گواہی ہر طرح کے معاملات میں مرد کی گواہی کے نصف ہے یا یہ ہدایت صرف مالی معاملات کے ساتھ مخصوص ہے، فرماتے ہیں کہ آیت قرض کے لین دین کے معاملات میں آئی ہے اور اس ہدایت کو اسی نوعیت کے معاملات کے ساتھ مخصوص سمجھنا قرین قیاس ہے، کیونکہ عورتیں اپنے مزاج اور فطری دائرۂ کار کی وجہ سے خاندان کے اندرونی واقعات اور ان کی تفصیلات کو تو خوب یاد رکھتی ہیں، لیکن مالی معاملات اور ان کی طے شدہ شرائط کو پوری تفصیلات کے ساتھ زیادہ عرصے تک یاد رکھنا اور پھر عدالت کچہری کا سامنا ان کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ان معاملات میں شریعت نے دو عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے (تدبر حدیث، صحیح بخاری ۲/ ۴۳۶)۔ مولانا اس ہدایت کی توجیہ کے ضمن میں بھی ابن القیم سے متفق ہیں کہ اس کا مقصد مردوں کے مقابلے میں خواتین کی کم تر حیثیت واضح کرنا نہیں، بلکہ ایک ایسی ذمہ داری ادا کرنے میں خواتین کے لیے سہارے کا انتظام کرنا ہے جو ان کی مزاجی خصوصیات اور حالات و مشاغل کے لحاظ سے ان کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۱)۔

مصنف نے مولانا اصلاحی کی اس رائے سے تو اتفاق کیا ہے، البتہ خواتین کے لیے اس سہارے کے انتظام کی ضرورت کو ایک دوسرے سماجی پہلو سے بھی واضح کیا ہے۔ ان کی رائے میں ''ہدایت کی گئی ہے کہ یہ بھاری

ذمہ داری اسی پر ڈالی جائے جو اس کا تحمل کر سکتا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فریقوں میں سے ایک فریق کی ناراضی، بلکہ بعض اوقات دشمنی کا خطرہ مول لے کر وہ بات کہنی پڑتی ہے جو فی الواقع طے ہوئی تھی۔ یہ اس زمانے میں بھی اتنا آسان نہیں ہے، کجا یہ کہ قبائلی اور جاگیر دارانہ سماج میں کوئی شخص اس کی ہمت کرے۔ قرآن نے اسی بنا پر فرمایا ہے کہ عورتوں کو گواہ بنانا پڑے تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنالیا جائے تاکہ عورت اگر اس دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے جو اس طرح کے موقعوں پر لازماً پڑتا ہے اور گواہی دیتے وقت گھبرا جائے تو دوسری عورت اس کا سہارا بن سکے‘‘(ماہنامہ اشراق، جولائی ۲۰۱۷ء، ۲۲)۔

تاہم مصنف کی رائے اس ہدایت کی نوعیت کے حوالے سے مولانا اصلاحی سے مختلف ہے اور وہ اسے مالی معاملات کے خاص دائرے میں بھی کوئی مطلوب شرعی پابندی کے بجائے سد ذریعہ کا حکم قرار دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمدنی حالات کی تبدیلی کے باعث اگر خواتین ہر طرح کے معاملات میں پر اعتماد طریقے سے گواہی دینے کی صلاحیت حاصل کر لیں تو ان کو گواہی میں اس طرح سہارا فراہم کرنے کا اہتمام لازم نہیں رہے گا۔

بعض احادیث میں نقل کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خواتین سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے لیے ’ناقصات عقل ودین‘ کی تعبیر استعمال فرمائی۔ اس پر خواتین نے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ تمھاری گواہی کا آدھا ہونا تمھاری عقل کا، جب کہ ماہواری کے ایام میں نماز نہ پڑھنے کی رخصت تمھارے دین کا نقصان ہے۔ فقہا عموماً اس حدیث کو خواتین کی گواہی کو مردوں کے مقابلے میں ناقص قرار دینے کی بنیاد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے جہاں دو عورتوں کو گواہ مقرر کرنے کی تفہیم معاشرتی وتمدنی حالات کی رعایت سے عورتوں پر مردوں کے مقابلے میں کم تر ذمہ داری عائد کرنے کے تناظر میں کی ہے، اسی طرح مذکورہ حدیث میں ’ناقصات عقل‘ کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کی خلقی کم زوری کے باعث دنیاوی معاملات میں ان پر کم ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آدھی گواہی سے تعبیر فرمایا ہے۔

غیر مسلم کی گواہی

’’۱۔ کسی شخص کی موت آجائے اور اُسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت کرنی ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنالے۔

۲۔ موت کا یہ مرحلہ اگر کسی شخص کو سفر میں پیش آئے اور گواہ بنانے کے لیے وہاں دو مسلمان میسر نہ ہوں تو مجبوری کی حالت میں وہ دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتا ہے۔'' (میزان ۵۱۷)

سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۱۰۶ میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے والے کو چاہیے کہ وہ وصیت کرتے وقت 'ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ'، یعنی اپنے اندر سے دو افراد کو اس پر گواہ مقرر کرے، البتہ اگر دوران سفر میں موت آجائے اور اپنے اندر سے گواہ میسر نہ ہوں تو 'اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ'، یعنی اپنے علاوہ دوسروں میں سے بھی دو گواہ مقرر کیے جا سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں عمومی طور پر بھی مختلف معاملات میں گواہ مقرر کر دینے کی ہدایت دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ گواہ ''تم میں سے'' ہونے چاہییں، چنانچہ پیشہ ور بدکار عورتوں کی شناخت کے ضمن میں 'فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ'، قرض سے متعلق احکام وہدایات میں 'مِنْ رِّجَالِكُمْ'، مرنے والے کو وصیت کی ہدایت دیتے ہوئے 'ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ' اور طلاق کے بعد علیحدگی اختیار کرنے کے موقع پر 'وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

جمہور فقہا ومفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات میں مسلمانوں ہی کو گواہ بنانا چاہیے اور اس سے صرف سفر کی حالت مستثنیٰ ہے جب موقع پر مسلمان گواہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے غیر مسلموں کو گواہ بنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو۔ جمہور فقہا غیر مسلموں کو گواہ بنانے کی اجازت کو سفر کی حالت میں وصیت کے معاملے کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک دستاویزی شہادت کے دائرے میں پیدا ہونے والی ضرورت کی دیگر صورتیں اس اجازت کے تحت نہیں آتیں۔ تاہم ابن تیمیہ کی رائے میں ضرورت کی باقی صورتوں کو بھی اس پر قیاس کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں اور سفر وحضر میں ضرورت کے ہر موقع پر غیر مسلم گواہ، مسلمان گواہوں کا بدل بن سکتے ہیں (ابن القیم، الطرق الحکمیۃ ۲۲۳)۔

مفسرین کے دوسرے گروہ کے مطابق اس ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ گواہوں کا تعلق اسی قبیلے سے ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے بھول چوک کا شکار ہونے کا امکان کم ہے، البتہ سفر کی حالت میں چونکہ ایسا کرنا ممکن نہیں، اس لیے جو بھی گواہ میسر ہوں، انھی کو گواہ مقرر کر لینا درست ہوگا (طبری، جامع البیان ۷/ ۱۰۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۶/ ۳۵۰)۔ اس تفسیر کے مطابق 'مِنْكُمْ' کی تصریح سے اس کا مقصد گواہی کے معاملات سے متعلق اس حکمت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ گواہوں کا تعلق اسی ماحول اور علاقے سے ہونا چاہیے جہاں معاملے کے فریقین رہتے ہیں اور جس میں کوئی معاملہ انجام پایا ہے تاکہ گواہ صورت حال سے پوری طرح واقف

ہوں اور بوقت ضرورت گواہی کے لیے دستیاب بھی ہوں۔ اس تفسیر کی رو سے زیر بحث آیت، گواہوں کے مسلمان یا غیر مسلم ہونے کے سوال سے غیر متعلق ہے۔

مسلم اور غیر مسلم کی گواہی میں فرق کی نظری اور قانونی اساس شوافع اور حنابلہ کے نزدیک عقیدے کا اختلاف ہے، چنانچہ وہ غیر مسلموں کو سرے سے شہادت اور قضا کا اہل ہی نہیں سمجھتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود غیر مسلموں پر بھی کسی غیر مسلم کے لیے گواہی یا قضا کا حق تسلیم نہیں کرتے (الشافعی، الام ۴/ ۲۲۵۔ الماوردی، الحاوی الکبیر ۲۱/ ۶۸)۔ فقہاے احناف نے اس توجیہ سے تو اتفاق نہیں کیا اور کہا ہے کہ غیر مسلموں میں بھی ایسے عادل اور قابل اعتماد افراد پائے جا سکتے ہیں جن کی گواہی پر بھروسا کیا جا سکے، چنانچہ وہ غیر مسلموں کو اصولاً گواہی کا اہل سمجھتے ہوئے غیر مسلموں کے باہمی معاملات میں ان کی گواہی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ وہ مسلمانوں کے خلاف ان کی گواہی کو قبول نہیں کرتے، جس کی وجہ ان کے نزدیک معروضی تناظر میں شہادت کی اہلیت یا دیانت وامانت پر اعتماد کا فقدان نہیں، بلکہ یہ تصور ہے کہ کسی غیر مسلم کی شہادت پر مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کرنے سے مسلمانوں پر غیر مسلموں کی بالادستی قبول کرنا لازم آتا ہے جو کہ درست نہیں۔

اس زاویے سے دیکھا جائے تو غیر مسلموں کی گواہی کو قبول نہ کرنے کی بنیاد اصلاً گواہی سے متعلق کسی قانونی نکتے پر نہیں، بلکہ 'عقد ذمہ' کے مخصوص قانونی تصور پر ہے، جس میں غیر مسلموں کے لیے ریاست کے دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت متعین کی گئی تھی۔ چنانچہ جدید جمہوری تصورات کے تحت قائم ہونے والی اسلامی ریاستوں میں عموماً اس تفریق کو قائم نہیں رکھا گیا۔ مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ کے زیر انتظام مرتب کیے جانے والے ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' میں گواہ کے مطلوبہ اوصاف میں سے مسلمان ہونے کی شرط حذف کر دی گئی تھی (مادہ ۱۶۸۶، ۱۷۰۰-۱۷۰۵)۔

مصنف نے سورۂ مائدہ کی زیر بحث آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین کی تشریح سے اتفاق کیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں بیان کیے گئے نصاب شہادت سے متعلق جو دو اصولی نکتے بیان کیے ہیں، وہ یہاں بھی ملحوظ ہیں:

ایک یہ کہ یہاں عدالت کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا گیا جس کی روشنی میں وہ کسی گواہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے گی، بلکہ ایک عام معاشرتی ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مالی معاملات میں تحریر و شہادت کا حتی الامکان بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جہاں تک عدالت کا تعلق ہے تو وہ کسی بھی

مقدمے میں گواہوں کی تعداد یا جنس یا مذہب کی بنیاد پر نہیں، بلکہ صدق وکذب اور خطا وصواب کے معروف معیارات کی روشنی میں گواہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے گی۔

دوسرا یہ کہ مصنف کے اصول کے مطابق مسلمانوں کو گواہ مقرر کرنے کے اہتمام کا تقاضا صرف ان صورتوں تک محدود ہونا چاہیے جہاں مطلوبہ اوصاف کے گواہوں کا میسر ہونا ممکن ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ حکم واقعاتی شہادت کے دائرے میں موثر نہیں ہونا چاہیے، جہاں کسی مخصوص مذہب کے پیروکار یا معیاری اوصاف کے حامل گواہ فراہم کرنا ممکن نہیں ہوتا اور موقع پر موجود گواہوں کی گواہی پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔

البتہ مصنف کے نقطۂ نظر سے ایک اہم غور طلب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس ہدایت کی بنیاد مصنف کے نزدیک کیا ہے؟ کیا وہ فقہا کی اس توجیہ سے اتفاق رکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے غیر مسلموں کی گواہی کو مسلمانوں کے حق میں موثر نہ ماننے کا اصول ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اس نوعیت کے بعض دیگر احکام کی طرح اس کا تعلق بھی اتمام حجت کے خاص اصول سے ہے یا یہ معاشرتی معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی اختلاط کو روکنے اور امتیاز کو قائم رکھنے کے مقصد سے دی گئی ایک عمومی ہدایت ہے؟

بظاہر یہ توجیہ مصنف کے اصولی زاویۂ نظر سے ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتی، اس لیے کہ شریعت میں غیر مسلموں کے ساتھ سماجی سطح پر اختلاط اور میل جول کی ممانعت نہیں کی گئی، بلکہ اہل کتاب کی خواتین سے نکاح کرنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کی مجالس میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی ہے (المائدہ ۵: ۵)۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں عملاً بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین انفرادی دوستی، تجارتی تعلقات اور معاشرتی روابط کی فضا موجود رہی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معاشرت کی سطح پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اختلاط اور میل جول کو روکنا شارع کے پیش نظر نہیں۔

ایک اور امکانی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس خصوصی اہتمام کا تعلق عہد رسالت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین معاشرتی تعلقات کی مخصوص نوعیت اور باہمی اعتماد کے فقدان سے مانا جائے۔ یعنی عہد رسالت کے معروضی تناظر میں چونکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین باہمی اعتماد پر مبنی معاشرتی میل جول موجود نہیں تھا، اس لیے قانون وعدالت کے معاملات میں کسی الجھن سے بچنے کے لیے مسلمانوں ہی کو گواہ مقرر کرنا زیادہ قرین مصلحت تھا۔ اس صورت میں یہ سد ذریعہ کی ایک ہدایت قرار پاتی ہے، نہ کہ کوئی ایسا حکم جس کی پابندی شارع کو اصلاً و بالذات مطلوب ہو۔

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر عرفان شہزاد

'خاتم النبیین' میں 'ختم نبوت' کا قطعی مفہوم

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

'خاتِم' بکسر 'ت' کا مطلب ختم کرنے والا ہے، لیکن 'خاتِم الشعرا' اور 'خاتِم الحکما' کا مطلب عظیم شاعر اور اعلیٰ درجے کا حکیم ہے۔ یہ زبان کا محاوراتی استعمال ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ 'خاتِم' کا مطلب ختم کرنے والا ہے اس لیے 'خاتِم الشعرا' اور 'خاتِم الحکما' کا مطلب شاعروں کو ختم کرنے والا اور حکیموں کو ختم کرنے والا یا آخری شاعر یا آخری حکیم ہونا چاہیے۔ اگر زبان کے اس محاوراتی استعمال سے واقفیت نہ ہو اور لفظی طور پر غلط مفہوم لے لیا، جیسے بعض نو آموز طلبہ کے ہاں کبھی ایسے ہو جاتا ہے تو اس کے لیے زبان کو بدلا نہیں جاتا، نہ معیار زبان کو پست کرتے ہوئے سپاٹ الفاظ اختیار کر لیے جاتے ہیں، بلکہ زبان و محاورہ سے آشنائی کی تلقین کی جاتی ہے۔

یہی معاملہ 'خاتَم' بفتح کا ہے۔ 'خاتَم' کا مطلب مہر ہے یا انگوٹھی۔ انگوٹھی کا مفہوم بھی در حقیقت مہر پر مبنی ہے، اس لیے کہ مہر کو انگوٹھی بنا کر پہنا جاتا تھا اور اسی سے مہر لگائی جاتی تھی۔ پھر یہ انگوٹھی کے لیے مجرد بھی ہو گیا۔ تاہم جب اس کا مطلب مہر ہو گا تو اس کا مفہوم 'seal'، یعنی مہر بندی ہی ہو گا۔ اس کا ایک استعمال اشٹام 'stamp' لگا کر تصدیق کرنا بھی ہے، لیکن یہ اس کا استعمال ہے، اس کا مفہوم نہیں۔ اس کا مفہوم مہر بند کرنا ہی ہے۔ ایک مہر بند خط یا اشٹام پیپر کسی بات کے لیے سند تصدیق بھی ہو سکتا ہے، مگر یہاں بھی مہر کا مطلب مہر بندی ہی ہو گا کہ خط یا اشٹام پیپر میں جو لکھا گیا ہے، اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ سند تصدیق ہے تو اس میں جو اور

جتنا لکھا ہے، بس وہی مراد ہے۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ کسی چیز کا استعمال اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہوتا۔

'خاتَم النبیین' کا مطلب نبیوں کی مہر ہے۔ اس کا مطلب نبیوں کی انگوٹھی بھی ہو سکتا تھا، مگر جس جملے میں یہ استعمال ہوا ہے، وہاں اس کے سیاق و سباق میں اس کی کوئی گنجایش نہیں، اسی لیے کسی نے بھی اس کا ترجمہ 'نبیوں کی انگوٹھی' نہیں کیا، بلکہ 'نبیوں کی مہر' ہی کیا ہے۔ مہر کے معنی میں اس کا مفہوم نبیوں پر مہر بندی ہے، یعنی ان کے سلسلے پر مہر بندی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مفہوم نہیں ہو سکتا۔ اگر اس مہر بندی کا استعمال نبیوں کی تصدیق کرنے کی سند کے طور پر ہوا ہو تو یہ اس کے استعمال کا بیان ہو گا۔ اس کا یہ استعمال اگر ہوا ہے تو یہ الگ سے مذکور ہونا بھی ضروری ہے، اگر نہیں ہوا تو زبان اور محاورہ میں یہ مفہوم لینے کی کوئی گنجایش نہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم مہر بندی سے آگے نہیں بڑھے گا۔

احمدی حضرات نے بھی زبان کی اسی پابندی کی وجہ سے 'خاتم النبیین' کا ترجمہ 'نبیوں کی مہر' ہی کیا ہے، مگر اس کے بعد وہ اس میں منطق داخل کرتے ہیں کہ چونکہ مہر تصدیق کے لیے بھی ''استعمال'' ہوتی ہے، اس لیے 'خاتم النبیین' کا مطلب 'نبیوں کی تصدیق کرنے والا' ہے۔ یہ مغالطہ ہے۔ کسی چیز کا استعمال الگ چیز ہے اور اس کا مفہوم الگ۔ جیسے اللہ کی کرسی جو زمین اور آسمانوں کو محیط ہے۔ اس کا مطلب خدا کی بادشاہت اور اختیار کا بیان ہے۔ یہ اس کا قطعی مفہوم ہے، لیکن کرسی کے مختلف استعمالات لے کر اس کے مفہوم میں داخل کرنا نامعقول منطق ہو گی کہ مثلاً کرسی بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، چنانچہ خدا اپنی کرسی پر بیٹھتا ہو گا وغیرہ۔ یہ زبان میں منطق ڈال کر اس کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔

'خاتم النبیین'، نبیوں کی مہر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا مفہوم، محاورے کی زبان میں پوری قطعیت سے بیان کرتا ہے۔ اس بات کو سپاٹ لفظوں میں کہا جا سکتا تھا، مگر یہ قرآن کے ادبی معیار کے خلاف ہوتا۔ یہ امکان کہ محاورے سے کسی کو اشتباہ لگ سکتا ہے یا کوئی شرارت کر سکتا ہے تو قرآن اس کم ذوقی کی خاطر اپنی زبان کا معیار پست نہیں کرتا۔

'خاتم النبیین' کا مفہوم، نبیوں کے سلسلے پر مہر بندی کا معنی طے ہو جانے کے بعد، اب سوال یہ پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے تشریعی نبیوں کے سلسلے کا خاتمہ مراد ہے یا غیر تشریعی؟ اس سے قطع نظر کہ آیت میں ''النبیین'' میں تمام انبیا شامل ہیں، اور اس سے بھی قطع نظر کہ تشریعی اور غیر تشریعی انبیا کی خود ساختہ تقسیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اس لیے کہ نبوت کا مطلب خدا سے خبر پانا ہے اور ہر نبی خواہ اس پر شریعت نازل ہو یا پہلے سے

موجود ہو، شریعت کا تابع ہی ہوتا ہے، نہ کہ صاحب شریعت نبی کا تابع۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو شریعت نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ نے قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس کے بعد مزید کسی شریعت اور اس کے لیے کسی صاحب شریعت نبی کی آمد کا سوال ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود اگر ختم نبوت کا اعلان کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو اس سے لازمی طور پر مراد بغیر نئی شریعت کے انبیا کے سلسلے کے اختتام کا اعلان ہے، کیونکہ بنی اسرائیل میں یہ روایت موجود تھی کہ وہاں شریعت کے ہوتے ہوئے بھی انبیا کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ ختم نبوت کے اعلان سے اس امکان کا خاتمہ مقصود ہے کہ شریعت کی موجودگی میں اب مزید انبیا نہیں آئیں گے، جیسا کہ بنی اسرائیل میں آتے رہے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

تصادم یا بقاے باہمی؟

یہ دنیا بقاے باہمی سے چلتی ہے، تصادم سے نہیں۔

مظاہر فطرت کی شہادت یہی ہے اور انسانی تاریخ کی گواہی بھی۔ دوسروں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا، کل نتیجہ خیز تھا، نہ آج ہو گا۔ عالم کے پرور دگار نے اپنی آخری کتاب میں یہ فرمایا کہ وہ چاہتا تو عالم انسانیت کو ایک امت بنا دیتا۔ اس نے یہ نہیں کیا کہ الٰہی اسکیم ہی تنوع کے اصول پر بنائی گئی ہے۔ اس نے انسانوں کو عقیدہ و فکر کے انتخاب کا حق دیا ہے، یہاں تک کہ چاہیں تو اپنے خالق کا انکار کر دیں۔ دوسری طرف مظاہر فطرت کی رنگا رنگی زمین کے حسن کو بڑھا دیتی ہے اور انسانی طبائع و خیالات کا تنوع انسانی تہذیب کو مالا مال کر دیتا ہے۔

سماج کی تشکیل جب عالم فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو زندگی میں توازن اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان سوچتا ہے۔ یہ لازم نہیں کہ سب کے نتائج فکر ایک جیسے ہوں۔ یہ اختلاف افکار کی دنیا میں رنگ بکھیر دیتا ہے۔ اردو شاعری کو دیکھیے۔ کئی دبستان وجود میں آ گئے اور کئی اصناف۔ غالب اور میر کی غزل سے ن م راشد اور مجید امجد کی نظم تک۔ میر انیس کے مرثیے سے اقبال کی مثنوی تک، ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں باندھا گیا۔ یوں لگا، جیسے شہر سخن میں بہار آ گئی۔ یہ سخن وری کے مختلف اسالیب ہیں، مگر ان میں کچھ اضافی ہے، نہ غیر ضروری۔ ہمارے ہاں، مگر کچھ ایسے بھی تھے جو لاہور اور سرگودھا کے نام پر باہم دست و گریباں رہے۔

جمہوریت فطرت کے اسی اصول کی سیاسی تجسیم ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تنوع کے اصول پر بنائی، اس لیے ہمیں اپنے سیاسی نظام میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس سے سیاسی تنازعات کا پر امن حل ممکن ہو گا اور اس کے ساتھ سماج بھی ارتقا کے مراحل طے کرے گا۔ یہ ارتقا ہے کہ عوام

ایک جماعت سے دوسری جماعت اور پھر تیسری جماعت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ یوں تجربات معاشرے کو فکری اور عملی اعتبار سے توانا سے توانا تر بناتے چلے جاتے ہیں۔ اگر اس بات کو سیاست میں قبول نہ کیا جاتا تو اس ملک میں صرف مسلم لیگ ہوتی یا پھر جماعت اسلامی اور مجلس احرار جیسی چند جماعتیں۔ کوئی پیپلز پارٹی ہوتی اور نہ تحریک انصاف۔

ان جماعتوں کی جگہ صرف اس لیے بنی کہ سماج میں اختلاف رائے کو گوارا کیا گیا اور مختلف خیالات کا ابلاغ ممکن ہوا۔ اس اختلاف کو ابلاغ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عوام کو نئے خیالات کے بارے میں معلوم ہو اور یہ بھی کہ ان کے سابقہ فیصلے درست تھے یا غلط۔ اسی لیے آزادی رائے کو جمہورت کا ناگزیر حصہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی سماج میں اگر رائے کے اظہار پر قدغن ہے تو وہ جمہوریت ناقص ہے۔ اسی طرح اگر ایک ہی سیاسی جماعت ہے تو وہ جمہوریت نہیں، یک جماعتی آمریت ہے۔

مغرب پر تنقید کے ہزاروں پہلو ہو سکتے ہیں اور سب کو درست بھی کہا جا سکتا ہے، مگر اس کا ہم پر یہ احسان ہے کہ اس نے عالم انسانیت کو ایک ایسا سیاسی نظام دیا جو نظام فطرت سے ہم آہنگ تھا۔ اس نے فطری تنوع کو ایک سیاسی بندوبست میں ڈھال دیا۔ اس سے صدیوں کا وہ مسئلہ حل ہوا جس نے انسانی سماج کو بدامنی کا گھر بنا رکھا تھا۔ یہ سوال انتقال اقتدار سے متعلق تھا۔ جمہوریت نے اسے یوں حل کیا کہ اب تصادم کا اندیشہ ختم ہو گیا۔ انسانی فیصلوں میں غلطی اور صحت، دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ جمہوریت نے اس کی گنجایش پیدا کر دی کہ انسانی غلطی کی تلافی، کسی بڑے نقصان کے بغیر ممکن ہو جائے۔ سیاسی نظام ایسا توانا ہو کہ ٹرمپ جیسی غلطیوں کا بوجھ اٹھا لے۔

یہ کسی معاشرے کی بدقسمتی ہو گی کہ وہ اس پیش رفت کو نظر انداز کرتے ہوئے ماضی کی طرف پلٹنا چاہے؛ جہاں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ سماج کی بھلائی ایک جابرانہ نظام سے وابستہ ہے؛ جہاں فسطائی سوچ اشرافیہ میں پھیل جائے اور یک جماعتی آمریت کے خواب دیکھے جانے لگیں؛ جہاں مذہب کی ایسی تعبیر کو فروغ ملے جو جمہوریت کو کفر قرار دیتی ہو، درآں حالیکہ سیاسی نظام کفر و ایمان کا فیصلہ نہیں کرتا، فصل نزاع کرتا ہے۔

یہ سراسر انسانی عمل ہے، تاہم عالم کے پروردگار نے بھی اہل اسلام کے بارے میں یہی فرمایا ہے کہ ”ان کا نظام ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوتا ہے“ (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود تھے، تب بھی مشورہ کیا جاتا تھا۔ ختم نبوت کے بعد تو اس کا امکان ہی باقی نہیں رہا کہ روزمرہ امور کے حل کے لیے

آسمان سے براہ راست کوئی ہدایت ملے۔ اب تو صرف مشورہ باقی ہے، جس میں غلطی اور صحت، دونوں کا امکان موجود ہے، تاہم اجتماعی دانش میں، سب جانتے ہیں کہ غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

آج حکومت اور ریاستی و سماجی اداروں کے مابین پر امن بقاے باہمی کے بجاے تصادم کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ معاملہ عدالت عظمیٰ کے ایک محترم جج سے شروع ہوا اور اب الیکشن کمیشن سے ہوتا ہوا میڈیا تک پہنچ چکا۔ لازم ہے کہ اس تصادم کا دروازہ بند ہو۔ ایک دو اداروں کا ایک پیج پر ہونا کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ریاست اور سماج کے سبھی ادارے حکومت کے ساتھ ایک پیج پر ہوں۔

حکومتوں کی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فریقوں کو ایک پیج پر لائیں۔ میرے نزدیک تو اس کا آغاز حکومت اور اپوزیشن کے مابین موافقت سے ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس پر تکرار کے ساتھ لکھا ہے۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا اور آج معاملات میڈیا تک پہنچ گئے۔ میڈیا کو میں ریاستی نہیں، سماجی ادارہ مانتا ہوں۔ یہ ریاست کا نہیں، سماج کا ستون ہے۔ میڈیا سے تصادم سماج سے تصادم کا آغاز بن سکتا ہے۔

کم از کم ہماری تاریخ یہی ہے کہ تصادم کا سب سے زیادہ نقصان حکومت وقت کو ہوتا ہے۔ حکومت کو افغانستان کی صورت حال سے قوت ملی ہے کہ اس عالم میں ملک کی فضا کسی احتجاج کے لیے سازگار نہیں رہی۔ اس کو موقع جان کر اتفاق راے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ سیاسی استحکام، حکومت اور ہیجان، اپوزیشن کے حق میں ہوتا ہے۔ تحریک انصاف کی قیادت کو شعوری طور پر سمجھنا ہو گا کہ وہ آج اپوزیشن میں نہیں، حکومت میں ہے۔ اگر وہ اس زاویۂ نظر سے سوچیں گے تو ان کی حکمت عملی بھی بدل جائے گی۔

انسان نے اپنے سماجی مسائل میں فطرت سے انحراف کیا تو اپنے مسائل میں اضافہ کیا۔ جنس انسانی جبلت ہے۔ اس کے مطالبات کو اگر فطرت کی روشنی میں مخاطب بنایا جائے تو زندگی پر سکون ہوتی ہے، اگر انھیں نظر انداز کیا جائے تو ایڈز جیسے جسمانی امراض سے لے کر بہت سے نفسیاتی عوارض انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ مغرب کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس نے فطرت کے اصول کا سیاست میں تو اطلاق کیا، مگر معاشرت میں بھلا دیا۔ ہم نے معاشرے میں کسی حد تک اسے قبول کیا تو بڑے مسائل سے محفوظ ہیں۔ سیاست میں، مگر ماضی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔

جمہوریت کی طرف ہماری پیش قدمی حوصلہ افزا نہیں؛ کبھی بھی نہیں تھی۔ ترقی معکوس تو اس سے بھی ابتر ہو گی۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔ پاکستان کی سرحدوں پر انتشار ہے۔ اس انتشار میں ہمارے دشمن اپنے

لیے مواقع تلاش کر رہے ہیں۔ یہ انتشار اگر داخل میں بھی سرایت کر گیا تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔اس کے لیے ہمیں تصادم نہیں، مفاہمت اور پر امن بقاے باہمی کے اصول کو اپنانا ہو گا۔ مظاہر فطرت کی پکار یہی ہے اور انسانی تاریخ کا سبق بھی یہی ہے۔ کوئی ہے جو سنے اور سمجھے۔

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۱۶/ ستمبر ۲۰۲۱ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۹)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

حسب و نسب

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ کا اصل نام رملہ (شاذ روایت: ہند) تھا۔ بعثت نبوی سے سترہ سال اور ہجرت مدینہ سے پینتیس سال قبل ۵۸۹ء میں مکہ (منطقہ تہامہ) میں پیدا ہوئیں۔ قریش کی دوسری بڑی شاخ بنوامیہ ان کا قبیلہ تھا۔ حضرت صخر بن حرب ان کے والد تھے جو اپنی کنیت ابوسفیان سے جانے جاتے ہیں۔ امیہ بن عبد شمس ان کے سکڑ دادا تھے۔ پانچویں جد عبد مناف بن قصی پر ان کا نسب نامہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب سے جا ملتا ہے۔ عبد شمس بن عبد مناف آپ کے پردادا ہاشم بن عبد مناف کے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام صفیہ بنت ابوالعاص تھا۔ حضرت معاویہ بن ابوسفیان اور حضرت یزید بن ابوسفیان ان کے باپ شریک بھائی تھے۔ ان کی سگی بہن امیمہ بنت ابوسفیان کو صحابیات میں شمار نہیں کیا گیا، حالاں کہ وہ یکے بعد دیگرے حضرت حویطب بن عبدالعزیٰ اور حضرت صفوان بن امیہ کی زوجیت میں رہیں اور دونوں فتح مکہ کے موقع پر ایمان لا چکے تھے۔ آپ کی ایک سوتیلی بہن کا نام بھی رملہ (رملۂ صغریٰ) تھا۔ حضرت عثمان بن عفان حضرت ام حبیبہ کے ماموں زاد

تھے۔ کچھ لوگوں نے آمنہ بنت عبد العزیٰ کو حضرت ام حبیبہ کی والدہ بتایا ہے، حالاں کہ وہ ان کی نانی تھیں۔ ابو لہب کی بیوی ام جمیل اروی بنت حرب جسے قرآن مجید میں 'حَمَّالَةَ الْحَطَبِ' (ایندھن ڈھونے والی، لگائی بجھائی کرنے والی) کے اوگن سے موصوف کیا گیا ہے، ان کی پھوپھی تھی۔ حضرت ام حبیبہ کا ایک سگا بھائی حنظلہ بن ابو سفیان جنگ بدر میں کفار کی طرف سے لڑا اور حضرت علی کے ہاتھوں مارا گیا۔

عبید اللہ بن جحش سے شادی

حضرت ام حبیبہ کا پہلا بیاہ بنوامیہ کے حلیف قبیلہ بنو اسد کے عبید اللہ بن جحش سے ہوا جو ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کے بھائی تھے۔ ان سے حبیبہ اور اس کے بعد عبد اللہ کی ولادت ہوئی۔ غالب امکان ہے کہ حبیبہ نے مکہ میں جنم لیا، تاہم کچھ مورخین کا خیال ہے کہ وہ ہجرت کے بعد حبشہ میں پیدا ہوئی۔ اسی سے حضرت ام حبیبہ کنیت کرتی تھیں۔

قبول اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ دار ارقم میں حاضر ہو کر مشرف بہ ایمان ہوئیں۔ اسلام میں سبقت کرنے کے باوجود 'السابقون الأولون' کی فہرست میں ان کا نام شامل نہیں۔

ہجرت حبشہ

مکہ میں دعوت اسلامی کا فروغ ہوا تو قریش کے سرداروں کو اپنی سیادت خطرے میں نظر آنے لگی۔ انھوں نے کم زور اور غریب مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ ان حالات میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت ام حبیبہ اپنے شوہر عبید اللہ کے ساتھ سفر ہجرت کر کے حبشہ (Abyssinia) پہنچ گئیں۔ ابو سفیان کی باندی اور حضرت ام حبیبہ کی خادمہ حضرت برکہ بنت یسار، عبید اللہ بن جحش کے خادم، حضرت برکہ کے شوہر حضرت قیس بن عبد اللہ اور ان کی بیٹی حضرت آمنہ بنت قیس جو حبیبہ کی انا تھی، ان کے ساتھ حبشہ گئے۔

عبید اللہ بن جحش کا ارتداد

حضرت ام حبیبہ نے حبشہ میں خواب میں اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش کو بری اور قبیح صورت میں دیکھا تو ڈر

گئیں۔ انھوں نے عبید اللہ کو یہ خواب سنایا تو اس نے کہا: ام حبیبہ، میں نے دین کے بارے میں غور و فکر کیا اور نصرانیت سے بہتر کوئی دین نہ پایا تو اس کو اختیار کر لیا۔ پھر دین محمد میں داخل ہوا اور اب پھر نصرانیت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ یوں وہ شیطان کے بہکاوے میں آ گیا، اسے دین نصاریٰ اس قدر بھایا کہ کتے کے نوزایدہ پلے کی مثال دے کر کہا: ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں اور تمھاری اس پلے کی طرح بند اور جڑی ہوئی ہیں۔

حضرت ام حبیبہ نے سمجھایا کہ یہ آپ کے لیے بہتر نہ ہو گا۔ لیکن اس نے ایک بات نہ سنی اور شراب کو شغل بنا لیا۔ الٹا حضرت ام حبیبہ کو بھی مرتد ہونے کی ترغیب دی، لیکن وہ دین اسلام پر قائم رہیں۔ اس وجہ سے ان میں علیحدگی ہو گئی اور کچھ دیر کے بعد دین نصرانیت پر عبید اللہ بن جحش کا انتقال ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق عبید اللہ کی موت نشے میں دھت ہو کر سمندر میں گرنے سے ہوئی۔ حضرت ام حبیبہ کے ایام تنہائی اور غم پریشانی میں گزرنے لگے، تاہم وہ اپنی بیٹی حبیبہ کے ساتھ حبشہ میں مقیم رہیں۔ خاوند کی وفات کے بعد انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے والد ابوسفیان نے انھیں ام المومنین کہہ کر پکارا۔ وہ گھبرا گئیں، خواب کی تاویل انھوں نے یہ کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے عقد نکاح کریں گے۔ ایک روایت کے مطابق عبید اللہ نے دم مرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وصیت کی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ارتداد کا انکار یا تفرد

سعودی عرب کی جامعۂ اسلامیہ میں تاریخ کے استاذ عبدالعزیز نور نے اپنے مقالہ ''القول الفصل في ردة عبيدالله بن جحش دراسة تاريخية حديثية'' میں قرار دیا ہے کہ ایک ایسے صحابی کو جس نے کبھی بتوں کی پوجا نہ کی ہو، اسلام قبول کرنے میں سبقت کی ہو، اپنا دین بچانے کے لیے حبشہ ہجرت کی ہو اور مرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وصیت کی ہو، ایسی روایات کی بنیاد پر مرتد اور عیسائی کہہ دیا جائے جو ضعیف اور مرسل ہیں، چاہے اہل تاریخ کے ہاں مشہور رہیں، کیونکہ ہر مشہور روایت صحیح نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح

۷ھ (شاذ روایت: ۶ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو دو خط دے کر اصحمہ نجاشی کے پاس حبشہ بھیجا۔ ایک خط میں اسے اسلام لانے کی باقاعدہ دعوت دی اور دوسرے میں وکیل بن کر حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے آپ کا نکاح کرنے کو کہا۔ آپ نے حضرت جعفر بن ابو طالب اور حبشہ

میں رہ جانے والے باقی مسلمانوں کو حضرت عمرو بن امیہ کے ساتھ مدینہ بھیجنے کا حکم بھی ارشاد کیا۔ نجاشی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب کو آنکھوں سے لگایا، تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھا اور حضرت جعفر کے ہاتھ پر کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔

دوسرے حکم کی تعمیل میں اس نے اپنی باندی ابرہہ کو حضرت ام حبیبہ کے پاس بھیجا۔ وہ خوشبودار کپڑے پہن کر ان کے پاس آئی اور شاہ نجاشی کا پیغام دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں وکیل بن کر ان کا بیاہ آپ سے کر دوں۔ آپ بھی اپنی شادی کے لیے کوئی وکیل مقرر کر دیں۔ حضرت ام حبیبہ نے اپنا خواب سچا ہونے کی بشارت سنی تو خوش ہو کر ابرہہ کو اپنے زیر استعمال چاندی کے کنگن، پازیب اور انگوٹھیاں عنایت کیں اور اپنے چچازاد حضرت خالد بن سعید کو وکیل مقرر کیا۔

اسی شام نجاشی نے حضرت جعفر بن ابو طالب اور حبشہ میں موجود دوسرے مسلمانوں کو رسم نکاح میں جمع ہونے کی دعوت دی اور یہ خطبۂ نکاح پڑھا: الحمد للہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور وہ رسول ہیں جن کی اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے بشارت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے ان کا نکاح کر دوں۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں میں اپنی طرف سے چار سو (دو سو: قتادہ) دینار مہر کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اس زمانے میں ایک دینار دس درہم کے برابر ہوتا تھا، اس لیے مہر کی رقم چار ہزار درہم بھی بتائی گئی ہے۔ حضرت خالد بن سعید نے جوابی خطبہ دیا۔ الحمد للہ، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ، یکتا معبود ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ نے انھیں ہدایت دے کر دین حق کو غالب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نکاح قبول کر کے ام حبیبہ کا ان سے بیاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے مہر کے دینار وصول کیے اور دعا کی کہ اللہ اس عقد میں خوب برکت دے (ابوداؤد، رقم ۲۱۰۷۔ نسائی، رقم ۳۳۵۰)۔ تب حضرت ام حبیبہ کی عمر چھتیس (ایک روایت: تیس برس) برس تھی۔ تمام مہر نجاشی نے اپنے پاس سے دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی رقم نہ بھیجی تھی (احمد، رقم ۲۷۴۰۸۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۱۹)۔

لوگ منتشر ہونے لگے تو نجاشی نے کہا: انبیا کی سنت ہے کہ رسم نکاح کے بعد دعوت طعام دی جاتی ہے چنانچہ حاضرین کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔

نکاح کے پر مسرت موقع پر حضرت ام حبیبہ نے ابرہہ کو مہر کی رقم میں سے پچاس دینار ہبہ کیے تو اس نے

قبول نہ کیے، بلکہ انگوٹھیاں، کنگن اور پازیب بھی لوٹا دیے اور کہا: شاہ نجاشی نے مجھے تاکید کی ہے کہ آپ سے کچھ نہ لوں۔ انھوں نے تو اپنی ملکاؤں کو آپ کو عطریات تحفہ میں دینے کو کہا ہے۔ اگلے روز وہ خوش بو، حبشہ کی سبز بوٹی ورس (Flemingia macrophylla, Kamala Memecylon umbellatum)، مشک اور سمندری عنبر (Black ambergris) لائی اور حضرت ام حبیبہ کے حوالے کر کے کہا: میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی کی اور اسلام قبول کر لیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان تک میرا اسلام پہنچا دیں۔ ابرہہ ہی نے ان کے سفر کی تمام تیاری کی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ام حبیبہ سے نکاح کی طرف اشارہ ہے: 'عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'، ''توقع ہے کہ اللہ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان الفت پیدا کر دے جن سے تم نے دشمنی مول لی ہے، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، خوب رحم کرنے والا ہے'' (الممتحنہ ۶۰: ۷)۔ دوسرے مفسرین نے اس بات کا رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ آیت مبارکہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ ابوسفیان کو حضرت ام حبیبہ کے نکاح کی خبر ملی تو خوش ہو کر کہا: وہ ایسے معزز و مکرم ہیں کہ ان کی ناک نیچی نہیں کی جا سکتی۔ اس رشتے سے ابوسفیان کا آپ سے بغض جاتا رہا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

عروہ بن زبیر کی روایت درست نہیں کہ حضرت ام حبیبہ کے ولی نکاح حضرت عثمان بنے تھے۔ وہ تو اس نکاح سے بہت پہلے مکہ جا چکے تھے اور وہاں سے مدینہ کو ہجرت کی۔ ابو بکر بن عثمان کا کہنا ہے کہ نجاشی کے بجاے حضرت عثمان نے گوشت اور مکھن پکوا کر حبشہ میں ولیمہ کی دعوت دی۔ جو حضرات مدینہ میں رسم نکاح کا انعقاد بتاتے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت عثمان حضرت ام حبیبہ کے ولی بنے اور انھوں نے ہی گوشت اور ثرید (porridge, sop) پکوا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ولیمہ منعقد کیا۔

مدینہ کو ہجرت

حضرت ام حبیبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے فوراً بعد ابرہہ کے ہاتھوں ملے ملکاؤں کے تمام تحفے لے کر مدینہ روانہ ہو گئیں۔ نجاشی نے آپ کے لیے قیمتی کپڑوں کا ہدیہ بھیجا۔ مشہور روایت کے مطابق حضرت شرحبیل بن حسنہ ان کے ساتھ گئے (ابوداؤد، رقم ۲۱۰۷۔ نسائی، رقم ۳۳۵۲)۔ ایک شاذ روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت ابو عامر اشعری کے ساتھ مدینہ آئیں۔ حضرت ابو عامر عبید بن سلیم حضرت ابو موسیٰ اشعری

کے چچا تھے اور انھی کے ساتھ حبشہ پہنچے تھے۔ طبری کی روایت درست نہیں کہ وہ حضرت امیہ بن عمرو اور تمام مہاجرین کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر آئیں۔ ابن سعد کا کہنا صحیح نہیں کہ حضرت ام حبیبہ مکہ سے حبشہ گئیں اور حبشہ سے مکہ واپس آئیں۔ مدینہ پہنچ کر وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی ازواج مطہرات کے ساتھ قیام پذیر ہو گئیں۔ ان کی بیٹی حضرت حبیبہ بھی ان کے ساتھ رہیں، بیٹے عبد اللہ کی واپسی اور ان کی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ حضرت ام حبیبہ نے آپ کو نکاح کا احوال سنایا اور ابرہہ کا سلام پہنچایا۔ آپ نے تبسم فرما کر جواب دیا: 'وعليها السلام ورحمة الله'۔ حضرت ام حبیبہ خوشبوئیں استعمال کرتیں تو آپ منع نہ فرماتے۔

ابن عساکر کا بیان ہے: حضرت ام حبیبہ اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ پہنچیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ اونٹنی کی نکیل پکڑ کر ان کے گھر لے جائیں۔ گھر میں کوڑا بکھرا ہوا تھا۔ حضرت ام حبیبہ کی باندی نے گھر کی صفائی کی، انھوں نے بالوں سے بنا ہوا گدا ڈال کر بستر بچھایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو خوشبو بکھری دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا: یہ قریش کی عورتیں ہیں، وادی بطحا کی، شہر کی رہنے والی ہیں، بدو اور صحرائی نہیں (تاریخ دمشق: ۱۵۲۲۱)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک روایت، ایک اشکال

رمضان ۸ھ، فتح مکہ: اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ابوسفیان نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی، میری تین درخواستیں قبول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا۔ کہا: میرے پاس عرب کی خوب صورت اور حسین ترین ام حبیبہ بنت ابوسفیان ہے، میں اسے آپ سے بیاہ دیتا ہوں۔ فرمایا: اچھا۔ حضرت ابوسفیان نے گزارش کی: اور معاویہ، اسے اپنے پاس کاتب وحی رکھ لیں۔ آپ نے جواب فرمایا: اچھا۔ مجھے سپہ سالار بنا دیجیے تاکہ کافروں سے اسی طرح لڑوں جس طرح مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اچھا (مسلم، رقم ۶۴۹۳۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۷۱۴ ۱۲۔ تاریخ دمشق: ۱۵۲۲۲)۔

فتح مکہ پر حضرت ابوسفیان کا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دختر حضرت ام حبیبہ کے نکاح کی پیش کش کرنا حقائق کے منافی ہے، کیونکہ وہ تو کم و بیش ڈیڑھ دو برس پہلے سے آپ کی زوجیت میں تھیں۔ اس بنا پر ابن حزم نے اس روایت کو موضوع قرار دیا اور اسے گھڑنے کا الزام عکرمہ بن عمار پر لگا دیا۔ ابن الصلاح نے دفاع میں کہا: ائمۂ حدیث میں سے کسی نے عکرمہ پر وضع حدیث کا الزام نہیں لگایا۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: یہ عکرمہ کا وہم بھی

ہو سکتا ہے۔ آخر کار محدثین نے یہ تاویل کی کہ حضرت ابوسفیان کا مقصد تجدید نکاح کرنا تھا، کیونکہ پہلا عقد ان کی شمولیت کے بغیر ہوا تھا اور وہ اسے اپنے لیے عار سمجھتے تھے (تکملة فتح الملهم ۲۰۹/۱۰)۔ منذری کا خیال ہے: اشکال ختم نہیں ہوا اور یہ روایت غلطی سے مبرا نہیں (السراج الوهاج ۲۰۲/۷)۔

رشتے کا امتداد

حضرت ام حبیبہ کو ام المومنین کا درجہ ملا تو کچھ لوگوں نے ان کے بھائی حضرت معاویہ کو اہل ایمان کا ماموں کہنا شروع کر دیا۔ اس سے ایک لطیفہ بھی وابستہ ہے۔ جنگ صفین میں جیش علی کے کئی لوگ حضرت معاویہ کی قید میں آئے۔ عمرو بن اوس اودی ان میں سے ایک تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کے قتل کا حکم صادر کیا تو انھوں نے کہا: میرے ماموں ہو کر مجھے قتل نہ کرائیں۔ حضرت معاویہ نے کہا: ہمارے اور اود کے مابین کوئی رشتہ ناتا نہیں۔ عمرو نے جواب دیا: ام المومنین ام حبیبہ میری ماں ہیں تو آپ میرے ماموں ہوئے۔ حضرت معاویہ نے کہا: اسیروں میں یہ ایک ہی تھا جسے یہ بات سوجھی اور انھیں چھوڑ دیا۔ ذہبی کہتے ہیں: امہات المومنین کی حرمت ان کی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں تک ممتد نہیں ہوتی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہلے کون، بعد میں کون

تاریخ اسلامی میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ حضرت ام سلمہ اور حضرت ام حبیبہ میں سے کون پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں۔ اسی تاریخ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوسلمہ نے ۲۷ جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی اور ان کی بیوہ حضرت ام سلمہ کا آپ سے نکاح شوال ۴ ھ میں ہوا۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ام حبیبہ کا نکاح ۴ھ میں، غزوۂ خندق کے بعد حضرت ام سلمہ سے پہلے ہوا۔ ابن مندہ کا کہنا ہے کہ یہ نکاح ۶ ھ میں ہوا۔ دوسرے مورخین نے ۷ ھ کا سن بتایا ہے۔ یہی درست ہے۔ قتادہ کی اس روایت کو کسی نے قابل التفات نہیں سمجھا کہ جب حضرت ام حبیبہ حبشہ سے مدینہ آگئیں تو آپ نے انھیں پیغام نکاح بھیجا۔ ابن حزم نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے کہ ان کا عقد فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوسفیان کے قبول اسلام کے بعد ہوا۔ اس طرح یہ واضح ہو گیا کہ حضرت ام حبیبہ کا آپ سے بیاہ حضرت ام سلمہ کے بعد ہوا۔

زہری نے ازواج مطہرات کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی یہ ترتیب بتائی ہے:

حضرت خدیجہ بنت خویلد، حضرت عائشہ بنت ابو بکر، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت ام سلمہ بنت ابوامیہ، حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان، حضرت زینب بنت جحش، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت میمونہ بنت حارث، حضرت جویریہ بنت حارث، حضرت صفیہ بنت حیی۔ یہ روایت یعقوب بن سفیان کی ہے، زہری سے ابن عساکر کی روایت مختلف ہے۔

ابن اسحاق نے یہ ترتیب روایت کی: حضرت خدیجہ بنت خویلد، حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت عائشہ بنت ابو بکر، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان، حضرت ام سلمہ بنت ابوامیہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ بنت حارث، حضرت صفیہ بنت حیی، حضرت میمونہ بنت حارث۔ ابن کثیر کہتے ہیں، یہ ترتیب زہری کی بیان کردہ ترتیب سے بہتر اور اقرب الی الصواب ہے، حالاں کہ اس میں حضرت ام سلمہ کو حضرت ام حبیبہ کے بعد رکھا گیا ہے۔

خصوصیت ام حبیبہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت ام حبیبہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ذہین و دانا اور فصیح و بلیغ تھیں۔ مشرک لیڈر ابوسفیان کی بیٹی ہوتے ہوئے انھوں نے اسلام قبول کیا، اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور دین حنیف پر ثابت قدم رہیں۔ آپ کی چچازاد ہونے کی وجہ سے ازواج مطہرات میں نسب میں آپ سے قریب ترین تھیں۔ سب سے زیادہ مہر ان کو دیا گیا اور ایک دوسرے ملک میں ہوتے ہوئے ان سے نکاح کیا گیا۔ حضرت خدیجہ کا حق مہر پانسو درہم مقرر کیا گیا، بقیہ تمام ازواج کو چار سو درہم مہر کے طور پر ادا کیے گئے۔ حضرت عائشہ سے پوچھا گیا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کتنا مہر دیا تو انھوں نے بتایا: ساڑھے بارہ اوقیے سونا (ابوداؤد، رقم ۲۱۰۵)۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہو تو پانسو درہم بنتے ہیں۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ سے پوچھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا حق مہر کتنا ہوتا تھا؟ انھوں نے بتایا، ساڑھے بارہ اوقیہ سونا (ابن ماجہ، رقم ۱۸۸۶۔ احمد، رقم ۲۴۶۲۶۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۷۷۶)۔ آج کل کے حساب سے یہ ساڑھے تین سو گرام بنتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام حبیبہ کی عزت افزائی کے لیے ان سے عقد کیا۔ اس طرح ان پر اسلام و ہجرت کی فضیلت مکمل ہوئی اور خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی نسبت قائم ہو گئی۔

والد پر دین توحید کو ترجیح دینا

صلح حدیبیہ کے موقع پر بنو خزاعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بن گئے، جب کہ ان کا مخالف قبیلہ

بنو بکر قریش سے مل گیا۔ ۷ھ میں بنو بکر کے ایک فرد نے آپ کی شان میں ہجو یہ اشعار پڑھے تو ایک خزاعی نے اس کا سر پھاڑ ڈالا۔ اس پر دونوں قبیلوں میں خوں ریز جنگ شروع ہو گئی۔ قریش نے اپنے حلیف بنو بکر کا کھل کر ساتھ دیا۔ یہ صلح حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی تھی، معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے قریش کو بنو خزاعہ کے مقتولوں کا خون بہا دینے یا بنو بکر کا ساتھ چھوڑنے کی تجویز دی، لیکن قریش نے معاہدہ توڑنے کو ترجیح دی۔ بعد میں انھیں ندامت ہوئی تو ابوسفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ روانہ کر دیا۔ ابوسفیان اپنی بیٹی ام المومنین حضرت ام حبیبہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے پوچھا: بچی، کیا یہ بستر میرے لائق نہیں یا میں اس بستر کے لائق نہیں۔ حضرت ام حبیبہ نے کہا، میں ایک مشرک و نجس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر نہیں بٹھا سکتی۔ ابوسفیان نے کہا: بیٹی، تو میرے پیچھے بہت بگڑ گئی ہے۔ حضرت ام حبیبہ نے کہا: مجھے اللہ نے اسلام کی ہدایت دی ہے اور آپ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ پھر وہ آپ کے پاس آیا، آپ نے کوئی مثبت جواب نہ دیا تو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت فاطمہ سے سفارش کرنے کو کہا۔ کسی نے مدد نہ کی تو ناچار مکہ لوٹ گیا۔

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کرنے کی تیاری شروع کر چکے تھے، لیکن حضرت ام حبیبہ نے اپنے والد کو اس بات کی خبر بھی نہ ہونے دی۔

جنگ خیبر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مال فے سے حضرت ام حبیبہ کو اسّی وسق کھجوریں اور بیس وسق جو عطا کیے۔ موجودہ زمانے کے پیمانوں کے مطابق ایک وسق ۱۴۴ کلو کے برابر ہوتا تھا۔

فتح مکہ

فتح مکہ کے بعد فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں میں حضرت ابوسفیان بھی شامل ہوئے تو حضرت ام حبیبہ کی خوشی دوچند ہو گئی۔

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت سودہ کو اجازت عطا فرمائی کہ مزدلفہ سے رات کے وقت ہی منیٰ کے لیے نکل جائیں، فجر کی نماز وہاں پڑھیں اور حاجیوں کے پہنچنے سے پہلے رمی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کرلیں، کیونکہ جسم بھاری ہونے کی وجہ سے ان کے لیے چلنا مشکل تھا۔ حضرت عائشہ نے ایسا کرنے کے لیے پوچھا تو آپ نے منع فرما دیا (نسائی، رقم ۳۰۵۰۳-۲۵۰۳۔ ابن ماجہ، رقم ۳۰۲۷۔ احمد، رقم ۵۱۰۴۲) حضرت ام حبیبہ بتاتی ہیں کہ آپ نے ان کو بھی رات کے وقت مزدلفہ سے منیٰ جانے کا حکم دیا (مسلم، رقم ۳۱۰۲۔ نسائی، رقم ۳۰۳۸۔ احمد، رقم ۲۶۷۷۶)۔ دوسری روایت میں وہ بیان کرتی ہیں کہ عہد رسالت میں ہم منہ اندھیرے مزدلفہ سے منیٰ کے لیے نکل جاتے تھے (مسلم، رقم ۳۱۰۳۔ احمد، رقم ۲۷۳۹۶)۔

عہد رسالت کے بعد حضرت ام حبیبہ کی زندگی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ام حبیبہ تینتیس سال حیات رہیں۔ اس دوران میں وہ دین ہدایت اور سنت نبوی پر سختی سے کاربند رہیں، ان کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا۔ انھیں امت مسلمہ کے حالات و مصائب کی بہت فکر رہتی تھی۔

خلافت فاروقی

حضرت عمر نے حج کے موقع پر ذوالحلیفہ کے مقام پر خوشبو محسوس کی تو پوچھا: یہ خوشبو کس کی طرف سے آرہی ہے؟ حضرت معاویہ نے کہا: امیر المومنین، میری جانب سے۔ ام حبیبہ نے لگائی اور کہا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حالت احرام میں خوشبو لگائی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: جاؤ اور انھیں دھوڈالنے کی تاکید کرو۔ چنانچہ حضرت معاویہ خوشبو دھلا کر واپس آئے (احمد، رقم ۲۶۷۵۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۳۶۷۴۔ مسند بزار، رقم ۱۰۹۹)۔

عہد عثمانی

۳۵ھ: بلوائیوں نے خلیفۂ سوم حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر کے ان کا پانی بند کر دیا تو انھوں نے اپنے ہمسائے حضرت عمرو بن حزم کے بیٹے کو حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور ازواج مطہرات کی طرف بھیجا۔ حضرت علی صبح سویرے آئے، ان کے سمجھانے کا بلوائیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حضرت ام حبیبہ بھی اپنے خادموں کے جلو میں خچر پر پانی کا برتن رکھ کر لائیں۔ بلوائیوں نے پوچھا: آپ کیوں آئی ہیں؟ تو انھوں نے کہا: بنوامیہ کی بیواؤں اور یتیموں کے اموال ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔ میں ان کے بارے میں عثمان سے بات کرنے آئی ہوں۔ باغیوں نے انھیں جھوٹا قرار دیا، بدتمیزی کی اور خچر کی زین کا تنگ کاٹ ڈالا۔ خچر بے قابو ہو گیا،

حضرت ام حبیبہ گر کر جان سے ہاتھ دھونے لگی تھیں، اگر لوگ آگے بڑھ کر خچر کو قابو نہ کر لیتے۔

نزاع معاویہ و علی میں بھائی کا ساتھ

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت ام حبیبہ نے ان کے اہل خانہ سے ان کی ڈاڑھی کے نوچے ہوئے بال اور وہ خون آلود قمیص منگوائی جو انھوں نے شہادت کے وقت پہن رکھی تھی اور حضرت نعمان بن بشیر کے ہاتھ حضرت معاویہ کے پاس دمشق بھیج دی۔ حضرت معاویہ نے منبر پر کھڑے ہو کر قمیص پھیلائی اور حضرت عثمان کے ساتھ ہونے والے ظلم کی دہائی دے کر ان کے خون بہا کا مطالبہ کرنے کی مہم شروع کی۔

مکہ میں منادی کرا دی گئی کہ ام المومنین حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بصرہ جا رہے ہیں۔ جو اسلام کی سربلندی چاہتا ہے، حضرت عثمان کا خون بہا لینا اور ان کے قتل کو جائز سمجھنے والوں سے جنگ کرنا چاہتا ہے، شامل ہو جائے۔ اس طرح ایک ہزار (یا تین ہزار) کے لگ بھگ سپاہی فراہم ہو گئے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے چار ماہ بعد لشکر روانہ ہوا تو حضرت ام حبیبہ سمیت باقی امہات المومنین اس صورت حال پر روتی روتی ذات عرق تک ساتھ گئیں پھر مدینہ کو لوٹ گئیں۔ اس نسبت سے اس دن کو 'روز گریہ' کہا گیا۔

صفر ۳۸ھ: محمد بن ابو بکر مصر میں حضرت معاویہ بن حدیج کے ہاتھوں قتل ہوا تو جہاں حضرت علی نے اسے اللہ کا صالح بندہ اور اپنا نیک فرزند قرار دیا، وہیں مدینہ میں حضرت عثمان کے اہل خانہ اور اقربا نے مسرت کا اظہار کیا۔ حضرت عثمان کی بھانجی حضرت ام حبیبہ نے بکرا بھون کر حضرت عائشہ کو بھیجا۔ حضرت عائشہ کو اس عمل سے بہت دکھ ہوا، انھوں نے قسم کھائی کہ کبھی بھنا ہوا گوشت نہیں کھائیں گی۔

اولاد

عبید اللہ بن جحش سے ایک بیٹی حبیبہ اور پھر ایک بیٹا عبد اللہ ہوئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت حبیبہ کا بیاہ داؤد بن عروہ ثقفی سے ہوا۔

دم آخریں

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اپنے آخری وقت میں ام حبیبہ نے مجھے بلا کر کہا: ہمارے درمیان سوتاپے کے معاملات ہوتے رہے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اور آپ کو معاف فرمائے۔ میں نے جواب دیا: اللہ آپ کی کامل مغفرت فرمائے اور ان رنجشوں سے آزاد کر دے۔ حضرت ام حبیبہ نے فرمایا: آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے،

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللہ آپ کو بھی مسرتیں دے۔ اس کے بعد حضرت ام حبیبہ نے ام المومنین ام سلمہ سے یہی مکالمہ کیا۔

وفات

ام المومنین حضرت ام حبیبہ نے اپنے بھائی حضرت معاویہ کے عہد حکومت میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ سن ۴۴ھ (۶۶۴ء) تھا۔ مروان نے نماز جنازہ پڑھائی، ان کے بھانجے اور بھتیجے قبر میں اترے اور جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا گیا ۔ان کی عمر چوہتر برس ہوئی۔ ایک شاذ روایت کے مطابق وہ اپنے بھائی حضرت معاویہ سے ملنے دمشق گئیں تو وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور انھیں باب صغیر کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ابو بکر بن ابو خیثمہ کہتے ہیں: ان کا انتقال حضرت معاویہ کی وفات (۶۰ھ) سے ایک سال پہلے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ام حبیبہ کی قبر حضرت علی کے مکان میں تھی۔ حضرت علی کے پوتے علی بن حسین زین العابدین کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مکان کا ایک گوشہ کھدوایا تو ایک کتبہ برآمد ہوا کہ یہ رملہ بنت صخر کی قبر ہے۔ میں نے اس کو اسی جگہ رکھ دیا۔

روایت حدیث

ام المومنین حضرت ام حبیبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینب بنت جحش سے پینسٹھ احادیث روایت کیں۔ ان میں سے انیتس کتب ستہ میں موجود ہیں، جب کہ دو متفق علیہ ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں: ان کے تین بھائی حضرت معاویہ بن ابوسفیان، حضرت عتبہ بن ابوسفیان، حضرت عنبسہ بن ابوسفیان، بھتیجے عبد اللہ بن عتبہ ،بیٹی حضرت حبیبہ، بھانجے ابوسفیان بن سعید ثقفی، عروہ بن زبیر، ابو صالح ذکوان، شہر بن حوشب، حضرت صفیہ بنت شیبہ، حضرت زینب بنت ابوسلمہ، حضرت ام حبیبہ کے آزاد کردہ سالم بن شوال اور ابوالجراح، شتیر بن شکل، حضرت انس بن مالک، حضرت معاویہ بن حدیج، محمد بن ابوسفیان اور ابوالملیح عامر بن اسامہ ہذلی۔

حضرت ام حبیبہ کی مشہور روایات

حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ حبشہ میں ماریہ نامی ایک گرجا تھا جو بہت خوب صورت تھا اور اس میں طرح طرح کی تصاویر سجی تھیں۔ آپ نے فرمایا: جب ان کا کوئی نیک آدمی فوت ہوتا ہے تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے ہیں اور اس میں یہ تصویریں نقش کر دیتے ہیں۔ یہ روز قیامت اللہ

کے ہاں بد ترین مخلوق شمار ہوں گے (بخاری، رقم ۷۴۲۷۔ مسلم، رقم ۱۱۱۸۔ نسائی، رقم ۷۰۵۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۶۷۳۰۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۴۶۲۹)۔

حضرت ام حبیبہ فرامین نبوی پر سختی سے عمل کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتی تھیں۔ان کے بھانجے ابوسفیان بن سعید آئے تو انھوں نے ان کو ستو کا پیالہ پلایا۔ستو پی کر ابوسفیان نے پانی منگوا کر کلی کی تو حضرت ام حبیبہ نے کہا: بھانجے: وضو کیوں نہیں کرتے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اس چیز کے کھانے پر وضو کرو جو آگ سے پکی ہو (ابوداؤد، رقم ۱۹۵۔ نسائی، رقم ۱۸۰۔ احمد، رقم ۲۶۷۷۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۵۵۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۸۳)۔ یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل سے منسوخ ہو چکا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ آپ نے بکری کے شانے کا گوشت تناول فرما کر نماز پڑھائی اور نیا وضو نہ کیا (بخاری، رقم ۲۰۷۔ مسلم، رقم ۷۱۶۔ ابوداؤد، رقم ۱۸۷)۔ حضرت سوید بن نعمان کی روایت میں ہے کہ آپ نے ستو کھا کر کلی کی اور وضو دہرائے بغیر مغرب کی نماز پڑھائی (بخاری، رقم ۲۰۹)۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں: وضو کرنے یا نہ کرنے کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل یہ تھا کہ آپ آگ کا پکا کھا کر دوبارہ وضو نہ کرتے تھے (ابوداؤد، رقم ۱۹۲۔ نسائی، رقم ۱۸۸۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۶۹۹۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۴۶۶۳۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۱۳۴)۔ خلفاے راشدین کا عمل بھی یہی تھا۔

سیدہ ام حبیبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنایا: جو مسلم بندہ خالص اللہ کے لیے ہر روز فرض نمازوں کے علاوہ بارہ رکعات نوافل پڑھ لیتا ہے، اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کر دیتا ہے (مسلم، رقم ۱۶۴۳۔ ابوداؤد، رقم ۱۲۵۰۔ نسائی، رقم ۱۸۰۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۱۴۱۔ احمد، رقم ۲۶۷۶۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۶۰۲۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۵۱۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۷۱۳۵)۔ اور بتایا کہ آپ کے ارشاد کے بعد میں یہ رکعتیں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں (احمد، رقم ۲۶۷۷۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۴۵)۔ان کے بھائی حضرت عنبسہ بن ابوسفیان اور ان کے شاگرد بھی برابر یہ نوافل ادا کرتے رہے۔ حضرت عائشہ کی روایت میں بارہ رکعات کی تفصیل اس طرح ہے: ظہر سے پہلے چار اور بعد میں دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں، عشا کے بعد دو رکعتیں اور نماز فجر سے پہلے دو رکعات (ترمذی، رقم ۴۱۴۔ نسائی، رقم ۱۷۹۵۔ ابن ماجہ، رقم ۱۱۴۰۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۴۵۲۵)۔ حضرت ام حبیبہ کی دوسری روایات میں بھی یہ تفصیل بیان ہوئی ہے۔اسلامیان پاکستان

اسی روایت کے مطابق فرائض اور سنن ادا کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محکم تعلق کی خواہش

ایک بار حضرت ام حبیبہ نے عرض کیا: یارسول اللہ، میری بہن ابوسفیان کی بیٹی کو اپنے عقد میں لے لیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تمھیں یہ پسند ہو گا؟ بولیں ہاں، میں اکیلی ہی آپ کی زوجہ نہیں ہوں، آپ کے ساتھ شریک کرنے میں مجھے اپنی بہن ہی زیادہ محبوب ہو گی۔ آپ نے فرمایا: (اہلیہ کی بہن ہونے کی وجہ سے) وہ میرے لیے حلال نہیں۔ حضرت ام حبیبہ نے کہا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی (درہ) سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ میری پرورش میں نہ ہوتی تب بھی مجھ پر حلال نہ ہوتی۔ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے، (ابولہب کی باندی) ثویبہ نے مجھے اور اس کے والد ابوسلمہ کو دودھ پلا رکھا ہے۔ اپنی بہنیں اور بیٹیاں میرے رشتے کے لیے پیش نہ کرو (بخاری، رقم ۵۱۰۱۔ مسلم، رقم ۳۵۷۸۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۵۵۔ نسائی، رقم ۳۲۸۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۳۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۷۳۲۲۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۳۲۔ السنن الصغریٰ، بیہقی، رقم ۲۴۳۹۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۷۱۲۸)۔ مسلم اور ابن ماجہ کی روایات میں حضرت عزہ بنت ابوسفیان کے نام کی صراحت ہے، طبرانی نے حضرت حمنہ بنت ابوسفیان اور بیہقی نے حضرت زینب بنت ابوسفیان کا نام لیا ہے۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: تب حضرت ام حبیبہ کو علم نہ ہو گا کہ دو بہنوں سے بہ یک وقت نکاح کرنا حرام ہے۔

حضرت ام حبیبہ نے ایک بار دعا کی: اے اللہ، مجھے اپنے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے والد ابوسفیان اور اپنے بھائی معاویہ کی زندگیوں سے خوب نفع پہنچانا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: تم نے اللہ سے ان مدتوں کی دعا کی جو پہلے سے متعین ہیں، ان ایام زندگی کی جو شمار کیے جا چکے ہیں اور اس روزی رزق کی جسے تقسیم کیا جا چکا۔ اللہ کسی شے کو اس کے مقررہ وقت سے مقدم کرے گا نہ اس میں تاخیر کرے گا۔ اگر تو اللہ سے دعا مانگتی کہ وہ تجھے عذاب جہنم یا عذاب قبر سے بچا لے تو یہ بہتر اور افضل ہوتا (مسلم، رقم ۶۸۶۴۔ احمد، رقم ۳۷۰۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۱۵۴۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۳۱۳)۔ آپ کے ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ تقدیر مبرم کو بدلنے کی خواہش سے بہتر ہے کہ انسان حسن انجام کی دعا کرے، یہ دعا قبول ہو گی تو دنیا و آخرت، دونوں میں بھلا ہو گا۔

شام سے حضرت ابوسفیان کی وفات کی خبر مدینہ پہنچی تو حضرت ام حبیبہ نے تین دن اپنے والد کا سوگ منایا اور اسی دن خلوق (مشک، کافور اور عنبر سے مرکبہ خوشبو) یا زعفران منگوا کر رخساروں اور کلائیوں پر لگایا اور کہا:

میں ایسا نہ کرتی اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا: اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے خاوند کے علاوہ کسی مرنے والے کا تین دن سے زیادہ ماتم منائے۔ ہاں اپنے شوہر کے لیے وہ چار ماہ دس دن سوگ میں بیٹھے گی (بخاری، رقم ۱۲۸۰۔ مسلم، رقم ۳۷۲۷۔ ابوداؤد، رقم ۲۲۹۹۔ ترمذی، رقم ۱۱۹۵۔ نسائی، رقم ۳۵۶۳۔ احمد، رقم ۲۶۷۶۶۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۹۳۶)۔ ابن حجر کہتے ہیں: حضرت ابوسفیان کی وفات مدینہ میں ہوئی، البتہ حضرت ام حبیبہ کے بھائی حضرت یزید بن ابوسفیان کے انتقال کی خبر شام سے آئی جو وہاں کے گورنر تھے۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے انتہائی ضعیف ہے کہ حضرت ام حبیبہ کی باری کے دن حضرت معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے حجرۂ مبارکہ میں آئے تو آپ نے فرمایا: تمھارا کیا معاملہ ہوگا اگر اللہ تمھیں قمیص خلافت پہنا دے۔ یہ سن کر حضرت ام حبیبہ آپ کے سامنے بیٹھ گئیں اور پوچھا: یارسول اللہ، اللہ میرے بھائی کو قمیص خلافت پہنائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں، لیکن اس میں کئی شر پیش آئیں گے۔ آپ نے شر (اصل میں: ھنات) کا لفظ تین بار فرمایا۔ حضرت ام حبیبہ نے کہا: یارسول اللہ، ان کے لیے دعا فرمائیں۔ آپ نے دعا کی: اللہ معاویہ کو ہدایت دے، اسے ہلاکت سے دور رکھنا اور آخرت و دنیا میں اس کی مغفرت کرنا (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۱۸۳۸)۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن اسحاق)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، تاریخ دمشق الکبیر (ابن عساکر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ابو یحییٰ

قربانی: سوچنے کی کچھ باتیں

عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔ ہر سال اس موقع پر قربانی کے جانوروں کی بہار آتی ہے۔ ہر گھر میں اِسی بات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ گائے خریدی جائے، بکرا لیا جائے یا کہیں حصہ ڈال دیا جائے۔ جہاں قربانی کے جانور آجاتے ہیں، وہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں کہ کس کا جانور زیادہ اچھا اور قیمتی ہے۔ جو لوگ مہنگے جانور خرید کرلاتے ہیں، وہ بڑے فخر سے اپنے جانوروں کی نمایش کرتے ہیں، جب کہ کم زور جانوروں کے مالک ان کی قیمت زیادہ بتا کر اپنا بھرم رکھتے ہیں۔ غرض مقابلہ بازی کی اک فضا ہر جگہ طاری ہو جاتی ہے۔ جو لوگ قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے، ان کا غم صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس مقابلے سے کیوں باہر ہیں یا پھر یہ کہ اِس موقع پر 'گوشت' کی خود کفالت میں وہ دوسروں کے محتاج ہوں گے۔

جانوروں کی خریداری کے بعد گھر کے مردوں کی اگلی فکر قصائی کی تلاش اور قربانی کے دن اُس کی دستیابی کو یقینی بنانا ہوتا ہے، جب کہ خواتین کے سامنے قربانی کے بعد گوشت کی جمع و تقسیم اور پھر اُس کے پکانے کے تھکا دینے والے مراحل ہوتے ہیں۔ بچے جانوروں کو گھمانے اور کھلانے پلانے میں مگن رہتے ہیں۔ ان کے اس شوق کا منتہائے کمال عید کے دن ذبح ہوتے جانوروں کا نظارہ ہے۔ غرض یہ کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر دین اسلام کی یہ عظیم عبادت لوگوں میں اگر کسی پہلو سے اہم ہے تو وہ محض 'جانور' اور اُن کے 'گوشت' کے حوالے سے ہے۔ دین کے حوالے سے اگر کوئی چیز زیر بحث آتی بھی ہے تو وہ قربانی کی عبادت کا تاریخی پس منظر اور اُس کے فقہی مسائل ہیں۔

دین اسلام میں قربانی کی حیثیت ایک عبادت کی ہے، اور دین خداوندی میں عبادات کی حقیقت یہ ہے کہ اُن

www.al-mawrid.org www.javedahmedghamidi.org

کے ذریعے سے بندہ اپنے پروردگار کے ساتھ اپنے تعلق کی یاددہانی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ قربانی کی یہ عبادت بندہ اور اُس کے رب کے درمیان تعلق کا وہ مظہر ہے جسے سرعنوان بنا کر وہ اپنے مالک کی خدمت میں اپنا یہ پیام بندگی بھیجتا ہے:

''اے پروردگار! آج میں ایک جانور تیرے نام پر ذبح کر رہا ہوں، اگر تیرا حکم ہوا تو میں اپنی جان بھی اِسی طرح تیرے حضور میں پیش کر دوں گا۔''

دراصل اِس دنیا میں بدنی اور مالی عبادات کے مواقع نماز و انفاق وغیرہ کی صورت میں کثرت سے سامنے آتے رہتے ہیں، جن سے ہم اپنے پروردگار کے ساتھ اپنے تعلق کی یاددہانی حاصل کرتے اور اُسے زندہ کرتے ہیں، تاہم خدا کے لیے جان دے دینا 'اسلام'، (یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے) کا سب سے بلند مقام ہے اور اس کے مواقع شاذ ہی زندگی میں آتے ہیں۔ اِس لیے قربانی کی یہ عبادت اُس کے علامتی اظہار کے طور پر مقرر کی گئی ہے۔ گویا ایک بندۂ مومن اِس عظیم عبادت کے ذریعے سے اپنے رب کے سامنے یہ اقرار کرتا ہے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب تیرے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے ہر اُمت کے لیے قربانی مشروع کی ہے تاکہ اللہ نے اُن کو جو چوپایے بخشے ہیں، اُن پر وہ (ذبح کرتے ہوئے) اُس کا نام لیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ چنانچہ تم اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر دو۔ اور خوش خبری دو اُن لوگوں کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔'' (الحج ۲۲: ۳۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ قربانی کی عبادت اپنی جان کو اپنے معبود کی نذر کر دینے کا علامتی اظہار ہے۔ اس کے ذریعے سے بندہ اپنے وجود کو آخری درجہ میں اپنے آقا کے حوالے کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ بندۂ مومن کے یہ جذبات اس کے مالک تک پہنچ جاتے ہیں، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ابدی رحمتوں کے لیے چن لیتا ہے۔ مزید برآں دنیا میں بھی وہ ان جانوروں کا گوشت انھیں کھانے کی اجازت دے کر انھیں یہ پیغام دیتا ہے کہ اپنی جان مجھے دے کر بھی تم مجھے کچھ نہیں دیتے، بلکہ دینے والا میں ہی رہتا ہوں۔ یہ گوشت کھاؤ اور یاد رکھو کہ مجھ سے سودا کرنے والا دنیا و آخرت، دونوں میں نقصان نہیں اٹھاتا۔

ایک طرف قربانی کی یہ عظیم عبادت اور اس میں پوشیدہ حکمت ہے اور دوسری طرف ہمارا وہ طرز عمل ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، جس میں ایک عام آدمی کا ذہن کبھی بھولے سے بھی قربانی کی اِس حقیقت کی طرف

منتقل نہیں ہوتا۔اِس سے بڑھ کر یہ کہ ریاکاری اور نمود و نمایش کا عنصر اِس عظیم عبادت میں اِس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ قربانی کے ذریعے سے اپنی بندگی کا اظہار تو دور کی چیز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق تو مخلوق کی نگاہ میں نمایاں ہونے کی نیت سے آدمی اگر حقیقت میں بھی اپنی جان دے دے تب بھی روز قیامت میں ایسے 'شہید' کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

ایک آخری بات اِس ضمن میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ دین اسلام کا اصل مقصود انسان کا 'تزکیہ' ہے، یعنی انسان کو پاکیزہ بنانا۔ تاہم قربانی کے اِس عمل میں ہم لوگ نہ صرف جانور ذبح کرتے ہیں، بلکہ اسلام کا یہ مقصود، یعنی پاکیزگی بھی ذبح کر دیتے ہیں۔ جگہ جگہ گندگی کے جو مظاہر عید الاضحیٰ کے موقع پر دیکھنے میں آتے ہیں، اس کی توقع کسی اچھے مسلمان سے تو کیا ایک اچھے انسان سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ قرآن پاک میں قربانی کے جانوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

"اللہ کو تمھاری ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔"

(الحج ۲۲: ۳۷)

تقویٰ اور بندگی کی دلی کیفیات تو ہمارے ہاں پہلے ہی ناپید ہیں۔ اس پر مزید ستم ہم یہ کرتے ہیں کہ گوشت اپنے فریج میں رکھ کر ہم، زبان حال سے، رب العٰلمین کی بارگاہ اقدس میں صرف گندگی اور غلاظت کے ڈھیر بھیجتے ہیں۔ چنانچہ قربانی کے دنوں میں اس کی حکمت و مصلحت کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے گھر کی طرح اپنے علاقے کو صاف رکھنا ہماری دینی ذمہ داری ہے، جس کی خلاف ورزی کم از کم ایک دینی تہوار کے موقع پر اور بالخصوص ایک عبادت کو انجام دیتے ہوئے بالکل نہیں ہونی چاہیے۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949

Snowhite

DRYCLEANERS

Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI

Quality Certified

Brands of the year Award

IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS

2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810